

بکھرے رنگ

(افسانوں کا مجموعہ)

ڈاکٹر عقیلہ

گرامی قدر جناب سلیم سالک صاحب

کے ذوق مطالعہ

کی

نذر

بصد خلوص

ڈاکٹر عقیلہ

راجوری

۳/دسمبر ۲۰۲۰ء

بکھرے رنگ

(افسانوں کا مجموعہ)

ڈاکٹر عقیلہ

بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

Bikhre Rang (Collection of Short Stories)
By ***Dr. Aqeela***
Year of first Edition 2020
ISBN 978-93-89733-92-1
Price Rs. 350/-

نام کتاب	:	بکھرے رنگ (افسانوں کا مجموعہ)
مصنف	:	ڈاکٹر عقیلہ
صفحات	:	۱۴۱
قیمت	:	۳۵۰ روپے
سن اشاعت	:	۲۰۲۰ء
تعداد	:	۵۰۰
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔ ۶
رابطہ/ پتہ	:	ڈاکٹر عقیلہ، اسسٹینٹ پروفیسر

بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری 185234 جموں کشمیر

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
H.o. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)
B.o. 3108, Vakil Street, Kusha Pandit, Lal Kuan, Delhi (INDIA)
Ph : 45678285, 45678286, 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

اپنے والدین

نیز

دہلی یونیورسٹی

اور

بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی

کے نام

(اس کتاب میں شامل افسانوں کے کردار اور
کہانیاں فرضی ہیں، مطابقت محض اتفاقی ہوگی۔ جس
کے لئے مصنف اور ناشر ذمہ دار نہیں ہونگے)

فہرست

ڈاکٹر ریاض توحیدی (کشمیر)

پیش لفظ

افسانہ کیا ہوتا ہے؟ تو اس موضوع پر ماہرین علم وادب کے متنوع خیالات و تاثرات موجود ہیں، تاہم مجموعی طور پر دیکھیں تو افسانہ پڑھنے کے بعد جو تاثر قاری کے ذہن میں جگہ پاتا ہے یا اگر کوئی اس افسانے سے متعلق جاننا چاہتا ہے تو قاری کی زبان سے افسانے کی کہانی شروع ہو جاتی ہے یعنی افسانے میں کہانی پن کا ہونا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھیں تو پیش نظر افسانوی مجموعہ "بکھرے رنگ" کے سبھی افسانے کوئی نہ کوئی کہانی ضرور پیش کرتے ہیں جو کہ کتاب کی مصنفہ ڈاکٹر عقیلہ صاحبہ کے شعور افسانہ اور کہانی کے پیش کرنے کی ہنرمندانہ صلاحیت کا قابل ستائش پہلو ہے۔ یہ مجموعہ حسب ترتیب گیارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ پیڑ کا جن، بکھرے رنگ، قاتل، طلاق، فریب، آخر میں نے پالیا تجھے، سرجو، چھوٹی سی محبت، شادی کا تحفہ، پچھتائے کا بھنور اور چال۔

کتاب کا نام ''بکھرے رنگ'' ہے اور شامل کتاب افسانوں میں واقعی زندگی کے بکھرے رنگوں کی کئی کہانیاں سانسیں لیتی محسوس ہوتی ہیں ،جن میں خصوصی طور پر ''پیڑ کا جن' بکھرے رنگ' فریب' آخر میں نے پالیا تجھے' شادی کا تحفہ' اور پچھتاوے کا بھنور،، کی کہانیاں فنی اور موضوعاتی پیش کش کی اچھی عکاسی کرتی ہیں۔فنی باریکیوں کو چھوڑ کر اگر موضوعاتی سطح پر ان افسانوں پر ارتکاز کریں تو مجموعی تاثر یہ ابھرتا ہے کہ ان افسانوں کی کہانیوں کا بنیادی محور سماجی خصوصاً عائلی مسائل (Domistic Issues) ہیں، جن میں تانیثی موضوعات (Feminist Topics) کی عکاسی زیادہ نظر آتی ہے' تو اس قسم کے افسانوں کا مطالعہ اور توضیح تانیثی تنقید (Gyno-Criticism) کی ذیل میں آتا ہے' یعنی اس تنقیدی نظریئے میں نسائی یا تانیثی ادب کو موضوعِ گفتگو بنایا جاتا ہے۔ اس تعلق سے دیکھیں تو مجموعہ میں ''بکھرے رنگ' طلاق' فریب' شادی کا تحفہ' پچھتاوے کا بھنور'' کی کہانیاں کئی سماجی و گھریلوں مسائل و موضوعات پر دلچسپ انداز سے تحریر ہوئی ہیں۔افسانہ 'بکھرے رنگ' کی مرکزی کردار 'سیما' اور 'شادی کا تحفہ' کی بنیادی کردار 'ماریا' دونوں با کردار اور شریف النفس ہوتی ہیں لیکن دونوں کی زندگیوں کے خوشنما رنگ اس وقت بکھر جاتے ہیں جب رات کے وقت 'سیما' گھر میں اکیلی ہوتی ہے اور بجلی چلے جانے کے بعد اچانک جب وہ دوسرے کمرے میں کانچ ٹوٹنے

کی آواز سن کر سہمی سہمی وہاں چلی جاتی ہے تو اسی وقت کالا ماسک لگائے انجانا شخص اسے دبوچ لیتا ہے اور اس کی بے بسی کا فائدہ اٹھا کر رفو چکر ہو جاتا ہے لیکن جب وہ سیما کی بے بسی کا فائدہ اٹھا رہا تھا تو سیما کی نظر میں اس کی انگوٹھی کا نقش سما جاتا ہے:

''تبھی اسکی نظر ہاتھ کی انگوٹھی پر پڑی ۔ وہ انگوٹھی کچھ عجیب تھی اس پر کھوپڑی کا نشان بنا تھا۔''

اور اسی سین کو افسانہ نگار نے بڑی ہنرمندی سے افسانے کے کلائمکس میں یوں پیش کیا ہے کہ کردار کی زندگی کے رنگ بکھر جاتے ہیں اور قاری بھی حیرت زا ہو جاتا ہے ۔کیونکہ جب سیما کی شادی 'آنند' نام کے لڑکے سے ہو جاتی ہے تو سہاگ والی رات جب اس کی نظر آنند کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیتے ہوئے انگوٹھی پر پڑتی ہے تو اس کے کردار کو داغ دار کرنے کی کہانی زلزلہ بن کر سامنے آجاتی ہے:

''آنند نے سیما کو بیڈ پر بٹھایا اور پانی کا گلاس آگے بڑھایا ......گلاس پکڑتے ہوئے جونہی سیما کی نظر آنند کی انگوٹھی پر پڑی تو گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر ٹوٹتے ہوئے سیما کے خواب رنگ ارمانوں کو بھی چکنا چور کر گیا۔''

اسی طرح افسانہ ''شادی کا تحفہ'' کی مرکزی کردار 'ماریا' کی کہانی

بھی ایک ایسی با کردار اور قابل لڑکی کی داستان ہے جو کالج میں اپنی قابلیت
اور کردار کی بدولت مثالی طالبہ ہوتی ہے لیکن چند اوباش لڑکے اس کے
کردار کو اس طرح سے داغ دار بنا دیتے ہیں کہ ایک تو سماج میں اس کی
اور اس کے گھر والوں کی عزت بھی داؤں پر لگ جاتی ہے اور دوسرا اس
کے والدین مجبوراً اس کی شادی ایک شادی شدہ مرد سے کروانے پر مجبور
ہو جاتے ہیں۔شادی کے بعد بھی اس کی معصومیت پر اعتبار نہیں کیا جاتا
اور اسے طلاق دی جاتی ہے۔طلاق ملنے پر وہ بے سہارا ہو جاتی ہے، نہ ہی
اسے اپنے گھر والے اپناتے ہیں اور نہ ہی رشتہ دار پناہ دیتے ہیں۔آخر
کار وہ زندگی کی نیا کو چلانے کے لئے ایک بنک میں نوکری کرتی ہے۔
ایک دن اچانک مارکیٹ میں 'شہلا' کی نظر اس پر پڑتی ہے اور وہ گاڑی
سے اتر کر اسے ملتی ہے۔وہ جب واپس گاڑی میں آتی ہے تو اس کا بھائی
اسے اس لڑکی کے بارے میں پوچھتا ہے۔جب شہلا آنسو بہاتے بہاتے
اپنی کالج میٹ کی روداد غم سناتی ہے تو ماجد خاموشی سے سب کچھ سنتا ہے۔
دوسرے دن شہلا کی شادی ہوتی ہے۔رخصتی سے پہلے جب وہ اپنے بھائی
ماجد کو وہاں موجود نہیں پاتی ہے تو وہ پریشان ہو کر ماں سے ماجد بھیا کے
بارے میں پوچھتی ہے۔یہاں پر افسانہ نگار نے ایسے دلچسپ انداز سے
افسانے کا کلائمکس پیش کیا ہے کہ ایک تو افسانہ قاری کے ذہن پر خوشگوار تاثر

چھوڑ جاتا ہے اور دوسرا یہ کہ سبھی مرد ظالم یا ہوس پرست نہیں ہوتے ہیں بلکہ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی مظلوم عورت کی زندگی میں خوشیوں کے رنگ بھی بھر دیتے ہیں:

"دلہن کی رخصتی کا وقت بھی آن پہنچا لیکن ماجد بھائی کا کچھ پتا نہیں تھا۔

امی! ماجد بھائی کہاں ہیں؟

تبھی شہلا کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

شہلا نے دوڑتے ہوئے دروازہ کھولا۔ تو سامنے ماجد بھائی مسکرا رہے تھے۔ شہلا روٹھنے والے انداز میں کہنے لگی۔ جایئے میں آپ سے بات نہیں کرتی۔

ارے پگلی! میں تیرے لئے شادی کا تحفہ لینے گیا تھا۔ کیا میں اپنی گڈیا کو بغیر تحفہ کے ہی بدا کر دیتا اور ماریا کو ہاتھ کے اشارے سے اندر بلاتے ہوئے کہا:

"شہلا۔۔۔تیری شادی کا تحفہ ہے تیری بھابھی۔۔۔"

کتاب کے دو افسانوں "پیڑ کا جن" اور "آخر میں نے پالیا تجھے" کی کہانیاں کچھ حد تک فینٹسی فکشن کی عکاسی کرتی ہے۔ فینٹسی فکشن کی توضیح کی گنجائش یہاں پر نہیں ہے تاہم اس کی کردار نگاری میں مافوق الفطرت

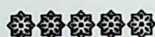
مخلوق (Supernatural Creature) کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ افسانہ 'پیڑ کا جن' میں اگرچہ یہ کردار توہم پرستی کے خوف کی عکاسی کرتا ہے تاہم افسانہ 'آخر میں نے پالیا تجھے'' میں فینٹسی تکنیک کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔

کتاب میں کئی اور افسانے بھی سماجی مسائل و موضوعات کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں، جن میں طلاق، پچھتاوئے کا بھنور (غصہ اور طلاق کے قبیح نتائج)''فریب'سرجو' (گھٹیا کرداروں کی روداد) اور چال وغیرہ شامل ہیں۔

مجموعے کی سبھی کہانیوں میں کسی نہ کسی سماجی پہلو کو واقعاتی رنگ میں پیش کرنے کی دلچسپ کوشش کی گئی ہے اور افسانہ نگار نے بڑی ہوشمندی سے ہر کہانی کو انجام تک پہنچانے کا فنکارانہ مظاہرہ کیا ہے جو کہ افسانہ تخلیق کرنے کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ اگر ان اہم چیزوں پر نظر نہیں ہوگی تو افسانے کی مشق بے کار بن جاتی ہے۔ اسلئے ڈاکٹر عقیلہ صاحبہ کو اس خوبصورت افسانوی گلدستہ کے لئے مبارک باد!

اب اگر تھوڑا بہت فن افسانہ کی باریکیوں یا لوازمات پر توجہ دیں تو افسانہ تخلیق کرنے کے دوران پلاٹ سازی' کردار نگاری' مکالمے' جملوں کی ساخت اور اسلوب وغیرہ لوازمات کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ پلاٹ سازی کے دوران کہانی کو منطقی انداز سے انجام تک پہنچانے کی اہم ضرورت ہوتی ہے تاکہ افسانہ قاری کے ذہن میں دیرپا یا چونکانے والا تاثر

چھوڑنے میں کامیاب رہے اور زبان و بیان کا معیاری استعمال بھی بڑا اہم ہوتا ہے نہ کہ عام طور پر ہم مقامی یا آپسی گفتگو کے درمیان جو لہجہ' الفاظ یا بولی بولتے ہیں۔مجموعے کے کئی افسانوں میں یہ کمیاں شدت سے محسوس ہوئیں۔ بہر حال' یہ ڈاکٹر عقیلہ صاحبہ کی پہلی فکشن سوغات ہیں تو وہ بیان (Narration) اور بیانیہ (Narrative) کے مابین فرق جانتے ہوئے سفر تخلیق جاری رکھیں گی اور قاری خوب سے خوب تر کی امید باندھ کر رکھیں گے۔



ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری

"بکھرے رنگ" تجزیاتی مطالعہ

جب ہم عورت ذات کو اُس کے تاریخی اور سماجی پس منظر کے آئینے میں دیکھتے ہیں تو وہ بہت حد تک ہمیں ایک مجبور و مقہور یا بہ الفاظ دیگر مرد ستم گری کی صورت میں نظر آتی ہے ۔ مانا کہ ایک طویل جدو جہد کے بعد اُس نے مرد غالب معاشرے میں ایک خاص مقام و مرتبہ حاصل کیا ہے لیکن آج کے اس سائنسی اور تکنیکی دور میں بھی عورت کے بنیادی مسائل اور اُس کی الجھنیں پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ بڑھ گئی ہیں ۔ بہت کم خوش نصیب والدین ایسے ہیں جو بیٹی کے پیدا ہونے پر خوشیاں مناتے ہیں ۔ آج بھی اکثر والدین بیٹیوں کی پیدائش پہ اندر ہی اندر کڑھتے ہیں ۔ بیٹی کو وہ مسائلِ حیات اور تشویش کی علامت تصور کرتے ہیں ۔ بیٹی پرایا دھن ہوتی ہے ، اُس کی بہتر تعلیم و تربیت ، اُس کی ملازمت ، اُس کے

اچھے گھراور بر کی فکراور پھر اُس کی پوری زندگی پر نظر دوڑائیں یا اُس کے مستقبل اور مختلف روپ کو ذہن میں رکھ کر سوچیں تو اس سے جڑی سچائیاں آنسو بہانے اور دل تھام کے بیٹھ جانے پر مجبور کرتی ہیں ۔انٹرنیٹ یا سوشل میڈیا کے اس دور میں ہماری بہو بیٹیاں طرح طرح کے مسائل اور اُلجھنوں سے جوجھ رہی ہیں ۔موبائل فون کے غلط استعمال نے جہاں شرم وحیا پر کاری ضرب لگائی ہے تو وہیں تکنیکی جرائم میں اضافہ کیا ہے ۔تکنیکی جرائم سے میری مراد یہ ہے کہ اب عام سیدھے سادے اور شریف لوگوں کو سماج کے کچھ ٹھگ ،لُٹیرے ،چور اوباش قسم کے لوگ موبائل فون پہ اُن کا اے ٹی ایم کارڈ نمبر اور کوڈ پوچھ کر روپے چرالیتے ہیں ۔فیس بُک اور واٹس ایپ کے ذریعے کئی طرح کی مجرمانہ حرکتیں دیکھنے میں آتی ہیں ۔عورت ذات اپنے مختلف روپ میں کہیں نہ کہیں خوف ،خدشہ اور استحصال کی شکار ہے یا پھر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہجر و وصال اور ذہنی خلفشار اُس کا مقدر بن کے رہ گیا ہے ۔بہت سے حساس والدین کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ بیٹیاں اگر پیدا ہوں تو اچھے مقدر کے ساتھ پیدا ہوں ۔بیٹی کے روپ میں عورت ذات اپنے والدین کی خدمت گزار ہوتی ہے ۔شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کی ناز برداری اور وفاداری میں لگ جاتی ہے ۔اُس کی خواہشوں کے احترام میں سولہ سنگھار کرتی ہے ۔ اتنا ہی نہیں اُسے اپنے

سسر، ساس، دیور، دیورانی اور نندوں تک کو خوش رکھنے کی ریہرسل کرنی پڑتی ہے۔ اپنے گھر آنگن کو خوب صورت بنانے کی فکر میں پڑ جاتی ہے۔ ماں کے روپ میں وہ بہت زیادہ ٹوٹتی بکھرتی ہے۔ بچّے کو جنم دینے کے بعد وہ اُس کے بول و براز کو صاف کرتی ہے۔ اُس کی کلکاریاں سُنتی ہے تو اپنے سارے رنج والم وقتی طور پر بھول جاتی ہے۔ ایک خوشگوار اور کامیاب اذدواجی زندگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ میاں، بیوی کی طبیعتیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوں۔

نسائی جذبات کے حوالے سے ایک ایسا افسانوں کا مجموعہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے جارہا ہے جس کا سرنامہ ''بکھرے رنگ'' ہے۔ ڈاکٹر عقیلہ اس کی مصنفہ ہیں۔ اس میں گیارہ افسانے شامل ہیں۔ جن کے عنوانات قاری کو دعوتِ مطالعہ دیتے ہیں۔ مثلاً ''پیڑ کا جن، بکھرے رنگ، قاتل، طلاق، فریب، آخر میں نے پالیا تجھے سزا، چھوٹی سی محبت، شادی کا تحفہ، انتظار'' اور ''چال''۔ ان تمام افسانوں میں عورت مختلف روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ کہیں دوشیزہ ہے تو کہیں بیوی، کہیں ماں تو کہیں محبوبہ اور کہیں قاتلہ۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان افسانوں کی مصنفہ نے اپنے آس پاس کے ماحول کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ نا موافق حالات وواقعات کی وقوع پذیری سے جو مسائل اور ذہنی الجھنیں پیدا ہوئی

ہیں اُن کو کہانی بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل ادبی تخلیق کار عام آدمی کے مقابلے میں بڑا حساس ہوتا ہے۔ کسی واقعے یا حادثے سے جب وہ شدید طور پر متاثر ہوتا ہے تو اُسے فنی جامہ پہنانے کی تڑپ اُسے بے چین رکھتی ہے۔ بالآخر جب یہ تڑپ شدت اختیار کرلیتی ہے تو تب اُسے فن پارے کی صورت میں قارئین کے سامنے لاتا ہے۔ یہاں یہ لازمی معلوم ہوتا ہے کہ زیرِنظر افسانوی مجموعے میں شامل افسانوں کی اصل روح تک پہنچنے کے لیے ان افسانوں کے موضوعات اور فنی برتاؤ پر بحوالہ گفتگو کی جائے۔

''پیڑ کا جن'' اپنے عنوان کے اعتبار سے اگرچہ علامتی نوعیت کا افسانہ ہے لیکن اس کی کہانی پورے بیانیہ انداز میں قاری کے دل میں شروع سے آخر تک ایک طرح کی گدگداہٹ سی پیدا کردیتی ہے۔ اس افسانے کے ذریعے ایک بے بس و مجبور خاتون اپنے شوہر کی حاکمانہ ذہنیت اور مرعوبیت سے تنگ آکر بالآخر ایک جن کا ڈراما کرکے نجات پانے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ برکت علی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم ہے وہ اپنی بیوی رقیہ بیگم کو بات بات پہ ڈانٹتا ہے جس کے باعث وہ تنگ آجاتی ہے اور اپنے شوہر کو راہِ راست پر لانے کے لیے جن کا روپ دھارن کرکے اپنے میاں کی خوب پٹائی کرتی ہے۔ اپنے ڈرامائی کردار کے بعد وہ یہ محسوس کرتی ہے کہ اُس کے شوہر کی انانیت اُس کے

وجود سے رخصت ہوگئی ہے اور وہ راہ راست پر آگیا ہے۔ مثلاً مذکورہ افسانے کے اس اقتباس پہ دھیان دیجیے کہ جس میں رقیہ بیگم کی وفاداری اور برکت علی کے مزاج کی بیزاری کو مُصنفہ نے ایک راوی کی حیثیت سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"ویسے برکت علی کھانے کے بڑے شوقین تھے......اور رقیہ بیگم شوہر کی پسند کو نظر میں رکھتے ہوئے بڑی محنت ،مشقت اور محبت سے کھانا بناتی اور گن گن کر سارے مسالے کھانے میں ڈالتی اور دسیوں بار چکھتی کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے اور جب اُن کے سامنے پیش کرتی تو برکت علی پہلا لقمہ منہ میں ڈالتے پھر ٹیڑھا سا منہ بنا کر یہ کہتے ہوئے تھوک دیتے۔

"یہ کیا کھانا بنایا ہے؟اتنے سال ہوگئے کھانا بناتے ہوئے ابھی تک تمھیں کھانا بنانا نہیں آیا۔اس میں تو نمک ہی نہیں ہے"اور کھانا چھوڑ کر اُٹھ جاتے۔رقیہ بیگم برکت علی کی ان حرکتوں سے کافی پریشان تھی......سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ برکت علی کو کیسے راستے پر لایا جائے۔تبھی رقیہ بیگم کو ایک آئڈیا آیا۔شاید یہی ایک راستہ تھا برکت

علی کو سُدھارنے کا"۔

یہ اصلاحی نوعیت کا افسانہ قاری کو یہ پیغام دیتا ہے کہ ایک پُرسکون ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے شوہر کے ذہن و دل میں حاکم ومحکوم کا کوئی بھی تصور نہیں ہونا چاہیے۔ ہر کام میں دونوں کی مشاورت ورفاقت نہایت ضروری ہے ورنہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سے گھرانے میاں، بیوی کی نوک جھونک اور ذہنی ناہم آہنگی کے سبب برباد ہوئے ہیں۔

افسانہ" بکھرے رنگ" کا مطالعہ قاری کو چونکاتا ہے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ سیما نام کی لڑکی اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ غالب گمان ہے کہ ہمارے سماج میں کتنی ہی لڑکیاں شادی سے پہلے سیما کی طرح پس پردہ بدمعاش قسم کے لوگوں کے ہاتھوں عصمت دری اور جنسی ہوس کی شکار ہوتی ہوں گی۔ رات کی تنہائی اور تاریکی میں جب سیما کے گھر میں کالے کپڑے پہنے چہرے پہ کالا ماسک لگائے کوئی بدمعاش قسم کا آدمی داخل ہوکر سیما کی عزت وعصمت لوٹنے لگتا ہے تو وہ بے بسی کے عالم میں بہت چھٹپٹاتی ہے۔ روتی ہے لیکن درندہ صفت آدمی اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد بھاگ جاتا ہے۔ سیما جب اپنے ساتھ پیش آمدہ واقعے کی روداد روتے ہوئے اپنی ماں کو سُناتی ہے تو اس کا پتہ سیما کے باپ کو بھی لگ جاتا ہے۔ باپ غصے کی حالت میں جونہی پولیس کو فون کرنے لگتا

ہے تو سیما کی ماں ریسور ہاتھ سے چھڑا لیتی ہے محض اس لیے کہ ہماری بیٹی کے ماتھے پہ بدنامی کا کلنک نہ لگ جائے گا۔ درج ذیل اقتباس کے حوالے سے کرداروں کی نفسیاتی کیفیت کا بخوبی اندزاہ ہو جاتا ہے:

''سیما نے بھرے گلے سے پوری تفصیل ماں کے سامنے بیان کردی۔ پاپا نے پولیس کو کال کرنا چاہا تو ماں نے جھٹ سے اُن کے ہاتھ سے ریسور فون پر رکھتے ہوئے کہا ''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ پولیس کو فون کرنے سے یہ بات پورے شہر میں پھیل جائے گی، جو بات اس وقت گھر کی چار دیواری میں ہے۔ اس میں ہماری اور ہماری بیٹی کی بدنامی ہوگی۔ اس لیے ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم خاموش رہیں'' اور سیما کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں سختی سے کہا ''اے لڑکی! خبر دار یہ بات کبھی کسی کے سامنے کی تو''۔

یہاں ایک المناک تاثر ذہن و دل پہ چھا جاتا ہے کہ لڑکی اور لڑکی کے والدین بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پاتے، زخم کو دکھائیں تو بدنام ہوتے ہیں اور نہ دکھائیں تو اندر ہی اندر درد کی ترنگ محسوس کرتے ہیں۔ بالآخر سیما کی شادی آنند نام کے ایک لڑکے کے ساتھ کردی

جاتی ہے۔جو کالج کے زمانے سے ہی سیما کو بہت چاہتا تھا۔افسانے کا اختتام تحیر آمیز ہے وہ اس لیے کہ شب زفاف میں سیما کو آنند کے ہاتھ کی انگوٹھی سے پتہ چل جاتا ہے کہ کالے ہاتھ والا آدمی آنند ہی ہے اور یوں اس کے سارے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔

افسانہ ''قاتل'' کا عنوان اگر قاتلہ رکھا گیا ہوتا تو بہتر رہتا کیونکہ یہاں ایک عورت قاتلہ کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے جو اپنے شرابی اور اوباش قسم کے شوہر سے تنگ آ کر اُس کو قتل کرنے کے بعد اُسے گھر کے ایک کمرے میں پُر اسرار حالت میں رکھ دیتی ہے۔شراب نے ہندوستانی سماج میں بہت سے گھروں کو اُجاڑا ہے۔سدھا ایک ایسی عورت ہے جو گھر کے سارے کام کرنے کے بعد بھی اپنے شرابی شوہر رنبیر کے ہاتھوں زدوکوب ہوتی ہے۔وہ ایک ایسی ہندو ناری ہے جو اپنے پتی کو دیوتا کی طرح دیکھنا چاہتی ہے لیکن اُس کا شوہر شراب اور شباب کا رسیا ہوتا ہے جو گھریلو ذمہ داریوں کے احساس سے عاری ہے۔رنبیر کو قتل کرنے کے بعد جب پولیس سدھا کے گھر میں داخل ہوتی ہے اور پوری تحقیقات کے بعد اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ رنبیر کا قتل اُس کی اپنی بیوی سدھا نے کیا ہے یہ سب جانتے ہوئے بھی پولیس سدھا کو گرفتار نہیں کرتی کیونکہ پولیس کے کھانے پینے کا انتظام سدھا پہلے ہی کر چکی ہوتی ہے۔

افسانہ ''طلاق'' میں ایک طلاق شُدہ عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ دانش مندوں کا قول ہے کہ جوش میں اگر آدمی ہوش سے کام نہ لے تو ساری عمر آدمی کو پچھتانا پڑتا ہے۔شاداب اور پری اس افسانے کے دو مرکزی کردار ہیں۔شاداب تلخ مزاج ہے جب کہ اُس کی بیوی پری، نرم مزاج اور پری پیکر ہے۔ دونوں کی شادی پیار ومحبت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اُن کے والدین نہیں چاہتے کہ شاداب اور پری کی شادی ہو لیکن یہ دونوں عشقیہ جذبات سے مغلوب ہو کر کورٹ میریج کر لیتے ہیں۔ایک روز جب پری سرکاری نوکری کے انٹرویو میں اپنی سلیکشن کی خوشخبری شاداب کو سناتی ہے تو شاداب اُس پہ خفا ہو جاتا ہے۔وہ یہ نہیں چاہتا ہے کہ اُس کی بیوی سرکاری نوکری کرے۔وہ غصے میں اُسے تین بار زبانی طلاق دے دیتا ہے۔ پری یہ سن کے بے ہوش ہو جاتی ہے۔طلاق دینے کے فوراً بعد شاداب اپنی غلطی پہ پچھتانا شروع کرتا ہے۔رونے لگتا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ پری سے معافی مانگنے لگتا ہے لیکن پری اُسے اپنے قریب آنے سے منع کرتی ہے یہ کہہ کر کہ وہ اب اُس کی بیوی نہیں رہی ہے۔آخر کار حلالہ کرنے پر بات آٹھہرتی ہے لیکن حلالہ کس سے کروایا جائے یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس شرعی مسئلے کے لیے اُنھیں رحمت چاچا مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ شاداب اپنی بیوی پری کو رحمت چاچا کے پاس ایک رات کے لیے چھوڑ

دیتا ہے۔ دوسرے دن جب وہ پری کو لینے رحمت چاچا کے فلیٹ پر جاتا ہے تو وہاں پہنچ کر اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رحمت چاچا رات کو ہی نہ صرف فلیٹ بلکہ شہر چھوڑ کے کہیں چلا گیا ہے۔

اس افسانے میں کہانی پن کے ساتھ ایک دلچسپ تجسس شروع سے آخر تک نظر آتا ہے۔ اس افسانے کی قرات ہمارے ضمیر کو جھنجھوڑتی ہے اور ذہن و دل پہ یہ تاثر چھوڑتی ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ بہت نازک ہوتا ہے۔ چاچا رحمت کا کردار ہمارے اعتقاد کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ طلاق کے بعد حلالہ ہماری نفسیاتی دُنیا میں ارتعاش سا پیدا کرتا ہے۔ یہاں بھی ہمیں عورت ذات مردوں کے ہاتھوں میں کٹھ پُتلی نظر آتی ہے۔ اسی افسانے کے حوالے سے یہ بات بھی کافی اہم ہے کہ شاداب اور پری کی شادی پیار ومحبت کی بنیاد پر کورٹ میں ہوتی ہے لیکن بعد میں طلاق پر نوبت آجاتی ہے۔ وہ دونوں اپنے والدین اور خاندان والوں کی پراوہ نہ کرتے ہوئے ایسا کر گزرتے ہیں۔ عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ کورٹ میریج یا لو میریج بعد میں میاں، بیوی کے درمیان تکرار اور چڑچڑا پن پیدا کرتی ہے اور ایسی بہت سی شادیوں کا لرزہ خیز انجام طلاق کی صورت میں سامنے آتا ہے کیونکہ ایسی شادیاں والدین اور بزرگوں کی نافرمانی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

افسانہ ''فریب'' کا اختتام چونکاتا ہے۔ ہمارے جدید معاشرتی نظام

پہ یہ افسانہ تازیانے کی حیثیت رکھتا ہے ۔گھروں میں نوکر یا نوکرانی پس پردہ کیا کچھ گُل کھلاتے ہیں یا گھر کا مالک اور مالکن اُن سے کیا کچھ کام لیتے ہیں، مذکورہ افسانہ اُس کا بین ثبوت ہے۔زیر نظر افسانے میں رمیش، مدھو، شیلا، گپتاجی اور آکاش جیسے کرداروں کی حرکات وسکنات سے افسانے کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے ۔رمیش کی ماں مدھو اپنے آوارہ اور نافرمان بیٹے سے اس بات پہ نالاں ہے کہ بیٹا پڑھائی لکھائی پہ کوئی خاص توجہ نہ دینے کے بجائے اپنے یاردوستوں کے ساتھ زیادہ وقت موبائل فون پہ گزارتا ہے ،چیٹنگ کرتا ہے ،نشہ کرتا ہے اور بے وقت گھر آتا ہے۔ایک روز پڑوس کے گپتاجی، مدھو کے گھر میں آکر بڑے کرخت لہجے میں اُس سے شکایت کرتے ہیں کہ آپ کا بیٹا میری لڑکی کو چھیڑتا ہے۔اُسے سمجھایا جائے ورنہ اُسے پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔رمیش کا باپ آکاش اپنے بیٹے کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیتا ہے اور افسانے میں اُس کا کردار اختتام سے پہلے تک ایک خاموش اور بہت حد تک گمنام سا کردار معلوم ہوتا ہے لیکن افسانے کے اختتام پر یہی کردار قاری کے ذہن پر حیرت واستعجاب کا باعث بنتا ہے۔شیلا نوکرانی ،کو جب ایک دن رمیش کی ماں اُلٹی کرتے ہوئے دیکھتی ہے تو سمجھ جاتی ہے کہ وہ کنواری ماں بننے جارہی ہے۔وہ اپنے بیٹے پر شک کرتی ہے کہ ضرور یہ میرے بیٹے کی حرکت ہوگی وہ غصے

میں اپنے بیٹے کے گال پہ چانٹا رسید کرتی ہے لیکن مدھو کی حیرت کی انتہا اُس وقت نہیں رہتی کہ جب وہ ایک کمرے میں اپنے شوہر آکاش کو شیلا کا گال سہلاتے ہوئے دیکھتی ہے۔اس شرمناک کیفیت کی عکاسی مصنفہ نے درج ذیل اقتباسات میں اس طرح کی ہے:

''دن بیتتے گئے۔ایک دن مدھو نے شیلا کو الٹی کرتے دیکھا''شیلا! شیلا! کیا ہوا تجھے؟''مدھو نے شیلا کو غور سے دیکھا تو شیلا سہم گئی۔

''کچھ نہیں ...... کچھ نہیں ......'' کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔مدھو بھی پیچھے پیچھے اُس کے کمرے میں گئی۔بار بار پوچھنے پر شیلا مالکن! مالکن! کہہ کر مدھو کے پیروں میں گر گئی۔

''مجھے بتا پگلی کس کا بچّہ ہے؟''

شیلا زور زور سے رونے لگی۔''میں جانتی ہوں آخر یہ کارستانی کس کی ہے۔ہمارا منہ تو کالا کر دیا اس لڑکے نے'' کہتے ہوئے مدھو تیز تیز قدموں سے رمیش کے کمرے میں داخل ہوئی اور اُسے ایک زوردار طماچہ رسید کر دیا۔

''نالائق ! آخر تُو میری کوکھ ہی میں کیوں نہیں مر گیا؟ تیری وجہ سے آج یہ دن دیکھنے کو تو نہیں ملتا''

''لیکن ماں! میں نے اب کیا کیا؟''

''شرم نہیں آتی پوچھتے ہوئے تُو نے کیا کیا؟''

افسانہ''فریب'' کے یہ اختتامی جملے ملاحظہ فرمائیے :

''میری جان! تُم گھبراؤ نہیں ۔میں نے کب انکار کیا ہے کہ یہ بچّہ میرا نہیں ۔ یہ بچّہ میرا ہے ۔مدھو کو اس بات کا کبھی پتا نہیں چلے گا۔میں تُم سے ضرور شادی کروں گا''

مدھو نے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو شیلا آکاش کی بانہوں میں رو رہی تھی اور آکاش اس کے چہرے کو سہلا رہا تھا''۔

ہمارے سماج میں بُرے لوگ جادو ،ٹونا اور دیگر کئی لعنتیں اور خباثتیں مثلاً حسد، رشک ،بغض ،عناد ،کینہ اور رنجشیں اپنے دل و دماغ میں پالتے رہتے ہیں ۔ زیادہ تر نوجوان لڑکے اور لڑکیوں پر جن ،دیو، پری ،چڑیل اور عفریت کا سایہ ہوجاتا ہے ۔جن سے چھٹکارہ پانے کے لیے سحر زدہ لوگ پیروں، فقیروں اور بابا قسم کے لوگوں کے پاس جا کر اُن کی آمدنی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

افسانہ ''آخر میں نے پالیا تُجھے'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ندیم پر کسی جنی کا سایہ ہو جاتا ہے اور بالآخر ایک پیر صاحب کی جھاڑ پھونک اور تعویز گنڈوں سے وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ پھر وہ آسیہ نام کی ایک لڑکی پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ کہانی کے اختتام پر معلوم ہوتا ہے کہ آسیہ وہی جنی ہوتی ہے جو پہلے ندیم پر فریفتہ ہوتی ہے۔ بعد میں ندیم اس پر یہ جانے بغیر فدا ہو جاتا ہے کہ آسیہ وہی جنی ہے۔ مگر جب ندیم کی اس سے شادی ہو جاتی ہے تو آسیہ یہ سوچتی ہے کہ بالآخر میں نے ندیم کو پالیا۔ اور یوں کہانی کا کلائمکس اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

بزرگوں کا قول ہے کہ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ جھوٹے، دھوکے بازوں، فریبیول اور منافقوں پہ اللہ کی طرف سے لعنت برستی ہے۔ افسانہ ''سزا'' میں ڈاکٹر عقیلہ نے ایک ایسے ہی شخص کو موضوع بنایا ہے جو کلیم صاحب جیسے رحم دل، سچے اچھے آدمی کو دھوکہ دے کر اُن کی غیر موجودگی میں اُن کی دکان سے بہت سا سامان بیچ کر خود راہِ فرار اختیار کرتا ہے اور پھر اُس پر اللہ کی ایسی مار پڑتی ہے کہ وہ بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ اس افسانے میں مصنفہ نے بغیر کسی تبلیغ کے قاری کے ذہن میں اس بات کا یقین پیدا کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ دیر سویر بُرے کام کرنے والے کو اُس کے بُرے کاموں کی سزا اسی دُنیا میں دینا شروع کر دیتا ہے۔ کلیم صاحب

کی دکان کے سامنے جب سرجو نام کا وہ شخص پہلی بار آتا ہے تو وہ اُس کی حالت زار دیکھ کے ترس کھاتے ہیں اُس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے ہیں۔کلیم صاحب کے اخلاقی رویّے کو زیر نظر افسانے میں ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"کلیم صاحب اپنی دُکان سے باہر نکلے اور اُس شخص کو دُکان کے اندر لے گئے اور بٹھاتے ہوئے اُسے ایک گلاس ٹھنڈا پانی دیا۔مسافر پانی پیتے ہی تروتازہ ہوگیا تو کلیم صاحب نے اُس سے پوچھا:

"بھئی !تُم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو"؟

مسافر نے جواب دیا"میں سونا پور گاؤں سے آیا ہوں۔ گاؤں میں آکال پڑگیا تھا۔میرے گھر کے سبھی لوگ آکال اور بھوک کی وجہ سے مرگئے۔اس لیے مجھے گاؤں چھوڑ کر شہر کی طرف آنا پڑا۔پھر کلیم صاحب کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر عقیلہ کے افسانوی موضوعات میں کسی حد تک تنوع نظر آتا ہے۔اُنھوں نے اپنے سماج میں جس طرح کے حالات وواقعات کو رونما ہوتے دیکھا ہے اُنھیں افسانے کا روپ دینے کی کوشش کی ہے۔

بالخصوص خواتین کی گھریلو زندگی اور اُن کی لغزشوں اور مردِ فریب آسا ذہنیت کو موضوع بنایا ہے۔ ہجر ووصال اور پیار ومحبت کی تڑپ سے تعلق رکھنے والے اُن کے چند افسانے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں زندگی کی حرارت بھی ہے اور شرارت بھی، درد بھی ہے اور احساس کی شدت بھی۔ اس حوالے سے اُن کا ایک طویل افسانہ ’’چھوٹی سی محبت‘‘ بطورِ مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ نجمہ اور محسن اس افسانے کے مرکزی کردار ہیں۔ نجمہ کے والد کی بے وقت موت اور پھر اِس کی ماں کا اپنے سسرال والوں سے کنارہ کشی اختیار کرکے ملازمت حاصل کرنا، کشمیر میں آکر ایک بڑے کرایے کے مکان میں رہنا کہ جہاں نجمہ کو محسن نام کا ایک سنجیدہ لڑکا نظر آتا ہے جس کو اُس کی ماں اور وہ خود بہت چاہتی ہے۔ محسن کی صورت اور سیرت دونوں ماں بیٹی کو بہت اچھی لگتی ہے۔ نجمہ کی ماں بیمار پڑ جاتی ہے لہٰذا وہ محسن کو اپنے پاس بلا کر اُسے اپنی بیٹی کا خیال رکھنے کی وصیت کرتی ہے۔ ماں کی وفات کے بعد محسن نجمہ کا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے لیکن وہ اُسے اپنی شریک حیات بنانے کے بجائے سلمان نام کے ایک اچھے گھرانے کے لڑکے سے اُس کی شادی کرنا چاہتا ہے مگر نجمہ کو یہ منظور نہیں ہوتا ہے۔ نجمہ ایک دن محسن کے گھر چلی جاتی ہے اور وہاں بڑی سلیقہ مندی سے محسن کا کمرہ سجاتی ہے۔ ہر چیز کو بڑی نفاست سے

رکھتی ہے ۔اس سب کے باوجود وہ نجمہ کو اپنی بیوی بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا ہے اُس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ محسن عمر میں نجمہ سے اٹھارہ سال بڑا ہوتا ہے ۔ وہ نجمہ سے یہ بات چھپاتا ہے کہ وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے جس کا انکشاف افسانے کے آخری اقتباس میں اس طرح کیا گیا ہے:

> ''ہارن بجاتی ہوئی گاڑی گھر کی پارکنگ میں آ کر رُکی اور کار سے دو چھوٹے بچّے اُترے اور مما مما کہتے ہوئے گھر کے اندر دوڑتے چلے گئے مما! مما! دیکھو پاپا نے ہمیں کتنی ساری چیزیں خرید کر دیں ۔بچّوں نے ہنگامہ کرتے ہوئے کہا:
>
> ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے ۔لیکن تمہارے پاپا ہیں کہاں؟''
>
> آشا نے بچّوں سے پوچھا۔
>
> ''ہم آپ کو چھوڑ کر کہاں جا سکتے ہیں؟'' یہ کہتے ہوئے محسن آشا کے پاس آگیا اور آشا کو گلے سے لگاتے ہوئے پیار سے بولا ''میری پیاری پگلی''۔

افسانہ ''شادی کا تحفہ'' میں بھی شہلا اور مریم نام کی لڑکیوں کی رفاقت اور اُن کی رنگ بدلتی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے ۔آج کے سوشل میڈیائی دور میں اسکول ،کالج اور یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم کئی لڑکیوں کے پاکیزہ

کردار کو مسخ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔مریم بھی انہی لڑکیوں میں شامل ہے لیکن شہلا جیسی اُس کی سہیلی اُس کے ساتھ بہت حد تک ہمدردی برتتی ہے۔ ماجد کے ساتھ مریم کی شادی شہلا کے ہمدردانہ جذبے کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔اس افسانے میں ایک باپ اپنی بیٹی کو اُس کے دُلہن رُوپ میں اس طرح کی نصیحت کرتا ہے جو بہت حد تک حقیقت پر مبنی ہے:

''مریم بیٹی! مجھے غلط نہیں سمجھنا ۔میں جانتا ہوں کہ تُو بے قصور ہے ۔میں نے جو ٹھیک سمجھا وہ کیا میری بچّی! لیکن میری ایک بات اپنے پلے باندھ لے ۔باپ کے گھر سے لڑکی کی ڈولی نکلتی ہے لیکن شوہر کے گھر سے بیوی کا جنازہ ہی نکلنا چاہیے۔میری پیاری بیٹی! اب وہی تیرا گھر ہے ۔جی کر یا مر کر تجھے وہاں نباہ کرنا ہوگا۔ہم لوگ اب تیرے لیے پرائے ہو چکے ہیں ۔واپس مت آنا''۔

افسانہ''انتظار''ڈاکٹر عقیلہ کے افسانوی مجموعے میں شامل افسانوں میں موضوعاتی اور فنی اعتبار سے سب سے بہترین افسانہ ہے ۔اس افسانے کا موضوع نیا ہے اور پلاٹ سازی میں مصنفہ نے اپنی تخلیقی حِس کا ثبوت فراہم کیا ہے ۔عام طور پر ازدواجی رشتوں میں ہم مرد کی بے وفائی کے تذکرے سنتے اور پڑھتے رہتے ہیں ۔یہ بات بھی مشہور ہے کہ عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی

ہے لیکن زیرِنظر افسانے میں ایک ایسی دوشیزہ کے کردار میں ہمارے سامنے آتی ہے جو نعیم جیسے بوالہوس مرد کی محبت کو بڑی حکمتِ عملی سے جانچتی پرکھتی ہے۔ نعیم اپنی بیوی رُخسانہ اور بچّوں سے بہت محبت کرتا ہے لیکن جب اُس کی پوسٹنگ الہ آباد میں ہوجاتی ہے تو وہ دھیرے دھیرے ماریہ نام کی ایک چنچل اور شوخ لڑکی کی دلکش اداؤں پہ فریفتہ ہوجاتا ہے اور وہ بھی اُسے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہوجاتی ہے یہاں تک کہ نعیم اپنی وفاشعار اور سلیقہ شعار بیوی رُخسانہ کو طلاق لکھ کے بذریعہ ڈاک بھیج دیتا ہے۔ طلاق کے بعد رُخسانہ پژمردہ سی ہوجاتی ہے۔ لیکن پڑوس کی رحیمن بوا اُس کی ڈھارس بندھاتی ہے اور اُسے جینے کا سہارا دیتی ہے۔ رخسانہ مطلقہ ہونے کے بعد بچّوں کی فیس نہیں دے پاتی۔ اسکول کا پرنسپل بچّوں کی فیس نہ ملنے کی صورت میں اُنھیں اسکول سے خارج کردینے کی اطلاع دیتا ہے۔ رُخسانہ پرنسپل کو اپنی ساری روداد غم سناتی ہے تو پرنسپل کو اُس پہ رحم آتا ہے۔ اس صورت میں پرنسپل اپنے اسکول میں رُخسانہ کو ملازم رکھتا ہے۔ اُس کی سلیقہ مندی سے بہت متاثر ہوتا ہے اور اُس سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ وہ اُس کے بچّوں کی کفالت کی ذمہ داری بھی قبول کرلیتا ہے کیونکہ پرنسپل کی پہلی بیوی کا انتقال ہوچکا ہوتا ہے۔ غرضیکہ رُخسانہ پرنسپل کی بیوی بن جاتی ہے۔ زیرِنظر افسانے کا دوسرا حیران کُن رُخ یہ ہے کہ نعیم جہاں

ماریہ کے لیے اپنی بیوی اور بچّوں کو چھوڑ دیتا ہے تو وہیں ماریہ اُسے ایک کمینہ، خود غرض، بے وفا اور ہوس پرست شوہر خیال کرتی ہے اور اُسے بڑے طنزیہ انداز میں کہتی ہے:

"نہیں مسٹر نعیم! تُم نے اپنے خاطر اپنے پریوار کو چھوڑا ہے۔ تُم جیسا خود غرض انسان کبھی کسی سے محبت نہیں کرسکتا۔ آج تُم نے اپنی چہیتی فرماں بردار بیوی اور بچّوں کو میری خاطر چھوڑ دیا ہے، کل تُم مجھے کسی اور کی خاطر چھوڑ دو گے؟ ہے نا!

مانا کہ طلاق مردوں کا حق ہے۔ وہ جب چاہے بغیر کسی گناہ کے اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے لیکن پھر بھی میں تُم پر بھروسہ نہیں کرسکتی۔ تُم دھوکے باز ہو! تُم جیسا آدمی کبھی کسی سے محبت نہیں کرسکتا اور میں تُم جیسے آدمی سے شادی نہیں کرسکتی"۔

نعیم کی حالت اُس دھوبی کے کُتّے کی سی ہوجاتی ہے جو نہ گھر کا رہتا ہے اور نہ گھاٹ کا یا بہ الفاظِ شاعر:

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

نعیم کو اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد اپنی بے وفائی اور غلطی کا شدید احساس ہو جاتا ہے وہ اپنی بیوی اور بچوں کی طرف مراجعت کرتا ہے لیکن اب اُس کی بیوی اور بچے پرنسپل کی تحویل میں آچکے ہوتے ہیں۔ازدواجی اور خونی رشتوں میں نہ ختم ہونے والی دراڑیں پڑ چکی ہوتی ہیں۔اس افسانے میں بچوں کی معصومانہ باتیں قاری کو آنسو بہانے پر مجبور کرتی ہیں۔

رحیمن بوا ایک ان پڑھ عورت کے طور پر پیش کی گئی ہے جو ان پڑھ ہوتے ہوئے بھی پڑھی لکھی ان معنوں میں معلوم ہوتی ہے کہ وہ عیار مردوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہے تبھی تو وہ رخسانہ کو سمجھاتی ہوئی کہتی ہے:

> "ہاں بیٹی! مردجات تو یوں ہی ہووے ہے۔چل اب تُو صبر کر۔تھاری قسمت میں یوں ہی لکھا تھا سو ہو گیا۔اب بچّوں کی کھاتر تھارے کو جینا بھی ہے اور جمہ واری بھی نبھانی ہے۔اب تو ہی ان بچّوں کا باپ بھی ہے اور ماں بھی۔دیکھ چھوری! مرد کو یہ حق ہووے کہ وہ جب چاہے بگیر کسی کارن طلاق دے سکے۔اس لیے اب جو ہوا وہ واپس نہ آسکے، تُو اب صبر کر اور بچّوں کو سنبھال"۔

اس افسانے کا مجموعی تاثر المناک ہے۔ماحول وفضا کے مطابق جذبات نگاری کی گئی ہے۔پلاٹ سازی میں تمام واقعات ایک منطقی

ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور وحدت تاثر قاری کو اپنی گرفت میں لے کر بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔لفظوں کا بے جا استعمال کہیں پر بھی نظر نہیں آتا۔اس افسانے کا آغاز اور انجام ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں ۔رحیمن بوا، رخسانہ اور اُس کے بچّوں کے کردار اپنی پوری معصومیت کے ساتھ سامنے آتے ہیں ۔ایک طرف نعیم کی بے وفائی پہ قاری کو غصہ آتا ہے تو دوسری طرف ماریہ کا مثبت و منفی کردار بھی سامنے آتا ہے ۔یہ بھی ممکن ہے کہ اگر ماریہ نعیم کو بطور ِآزمائش اپنی طرف مائل نہ کرتی تو رخسانہ کا گھر برباد نہ ہوا ہوتا۔

ساس، بہو کے جھگڑے بھی اس دھرتی پر بہت پرانے زمانے سے سُننے اور دیکھنے میں آتے رہے ہیں ۔کچھ برس پہلے ٹیلی ویژن پہ ایک دلچسپ اور سبق آموز ڈراما قسط وار چلتا تھا اُس کا نام تھا''ساس بھی کبھی بہوتھی''، ہرگھر کے افراد اُسے بڑے شوق سے دیکھتے تھے ۔والدین اپنی اولاد کو اپنا خون پسینہ بہا کر بڑے ناز و نعم سے پڑھاتے لکھاتے ہیں اُن کے ارمانوں کو پورا کرنے میں کوئی بھی کسر اُٹھائے نہیں رکھتے ،لیکن شادی ہوتے ہی کئی بیٹوں کو اُن کی بیویاں اپنی ماں سے دُور کردیتی ہیں اور ساس یہ سوچ کے اپنے دم خم میں رہتی ہے کہ بہو کے آنے سے پہلے اُس نے گھر کو ہر طرح سے بنایا ہے ،سجایا ہے۔افسانہ''چال''کی ساس،

ساس سے زیادہ اپنی بہو کرن کے لیے ماں کا سا کردار ادا کرتی ہے لیکن اس کے باوجود کرن یہ نہیں چاہتی کہ ساس مجھ پہ اور میرے گھر والے پہ حاوی رہے۔اُسے یہ برداشت نہیں ہوتا ہے کہ اُس کا شوہر وسیم ہر کام کرنے سے پہلے اپنی ماں سے اجازت لے۔چنانچہ وہ وسیم سے خفا ہو کر اپنے میکے چلی جاتی ہے اور اپنی ماں سے مشورہ کرتی ہے۔ماں اُسے یہ مشورہ دیتی ہے کہ وہ واپس اپنے گھر میں جا کر ہر وقت اپنی ساس کی خدمت میں لگ جائے اور اپنے شوہر وسیم کی طرف کوئی بھی توجہ نہ دے۔اس طرح وسیم تنگ آ کر اپنی ماں سے کنارہ کشی اختیار کر لے گا۔ کرن کو اپنی ماں کا یہ مشورہ بہت پسند آجاتا ہے۔وہ فوراً وسیم کو فون کر کے اپنے پاس بلاتی ہے اور واپس گھر میں آنا چاہتی ہے۔وسیم، کرن کو واپس گھر لے آتا ہے۔وہ ہر وقت ساس کی خدمت کرنے لگتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وسیم تنگ آ کر اپنی ماں کو اولڈ ایج ہوم میں پہنچا دیتا ہے اور کرن اپنی ماں کو یہ خوشخبری سناتی ہے کہ اُس کی چال کارگر ثابت ہوئی۔یہ افسانہ بھی قاری کو رنجیدہ کر دیتا ہے۔ڈاکٹر عقیلہ نے اس افسانے میں ایک اہم مسئلے کو موضوع بنایا ہے۔عصری معاشرے میں والدین کے ساتھ اولاد نے جو حسن سِلوک اور ایثار و ہمدردی کا جذبہ روا رکھنا چاہیے تھا اُس کا فقدان ہے۔وسیم اپنی ماں کو شادی سے پہلے اور بعد میں بھی بہت خوش

دیکھنا چاہتا ہے اسی لیے وہ اپنی بیوی کرن سے کہتا ہے:

''ماشاءاللہ! کرن تم بہت خوب صورت ہو لیکن سُنو! میں تم سے ایک بات ابھی صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں۔ دُنیا میں میری امی میرے لیے سب کچھ ہے۔ابو کے انتقال کے بعد امی نے بہت محنت و مشقت سے مجھے پال پوس کر بڑا کیا۔مجھے پڑھایا لکھایا۔میں اپنی امی سے بہت محبت کرتا ہوں۔کرن اس لیے میں چاہتا ہوں کہ امی کو کبھی بھی کوئی تکلیف نہ ہو''

بعد میں وسیم اپنی بیوی کرن کی چال کو نہ سمجھتے ہوئے ماں بیٹے کے مقدس رشتے کو کس طرح پامال کرتا ہے وہ مذکورہ افسانہ پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے۔اس افسانے میں ماں جیسی عظیم ہستی کی عظمت قاری کے ذہن کو جھنجھوڑتی ہے اور بے رحم بہو بیٹے کی سوچ اور اُن کی نہ زیبا حرکت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اُن پر لعنت بھیجنے کو جی چاہتا ہے۔کرن کی ماں کا مشورہ جب ایک کامیاب چال کی صورت اختیار کرلیتا ہے تو وہ اپنی ماں کو ان الفاظ میں خوشخبری سناتی ہے:

''مبارک ہو ممی! آپ کی چال کامیاب رہی۔بڑھیا ہمارے پلان کے مطابق اولڈ ایج ہوم جاچکی ہے۔

بڑھیا کی خدمت کرتے کرتے تو میرے ہاتھ پیر تھک گئے تھے لیکن ممی ! آپ کا پلان وقعی Solid تھا۔اب اتنے بڑے گھر کی میں اکیلی رانی ہوں۔اب صرف میرا ہی حکم چلے گا۔ورنہ وہ بڑھیا تو میری آنکھ میں کانٹے کی طرح چبھتی تھی۔ممی! آپ نے اس بڑھیا کو دودھ میں مکھی کی طرح نکال دیا۔میں وسیم کی نظروں میں خدمت گذار بہو ثابت ہوئی اور وہ بے وقوف ہماری چال کو سمجھ بھی نہ سکا۔آپ نے صحیح کہا تھا ممی! سانپ بھی مرگیا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی" اور زور زور سے کرن اور اس کی ماں ہنسنے لگیں"۔

زیرنظر افسانوی مجموعہ" بکھرے رنگ" میں شامل تمام افسانوں کا موضوعاتی اور فنی اعتبار سے مطالعہ کرنے کے بعد مجھے ذاتی طور پر اس بات کی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر عقیلہ نے عربی زبان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اُردو میں افسانے لکھتی ہیں۔ گویا افسانہ مزاج ہیں اور افسانہ نگاری کے ذریعے اُنھوں نے خواتین کے مسائل کو اُبھارا ہے۔وہ ایک صحت مند معاشرے کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ اُن کے افسانوی کردار ہمارے ماحول و معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اُن کے افسانوں میں دلچسپ مکالمہ نگاری کا عنصر موجود ہے۔اُنھوں نے علامتیت، تجریدیت اور استعاریت کے بجائے بیانیہ اُسلوب میں افسانے لکھے ہیں جو قاری کے ذہن و دل میں بہ آسانی اپنا گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔وہ افسانہ نگاری کے ذریعے بہت کچھ کہنا چاہتی ہیں۔اس کے لیے انھوں نے راست بیانیہ اُسلوب اختیار کیا ہے۔کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی والا انداز تحریر اُن کے افسانوں میں نہیں پایا جاتا۔یہ بڑی بات ہے۔ڈاکٹر عقیلہ کا افسانوی سفر ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے۔ابھی اُنھیں بہت دُور کا سفر کرنا ہے۔کسی انگریز دانشور کا مشہور مقولہ ہے کہ Practice makes a man perfect یعنی مشق سے انسان قابل بنتا ہے۔ڈاکٹر عقیلہ بہت محنت کر رہی ہیں۔اُن کا افسانوی مستقبل انشاءاللہ تابناک ہوگا اور اُن کے پہلے افسانوی مجموعے ''بکھرے رنگ''، میں جونسائی جذباتیت در آئی ہے وہ ادبی حلقوں میں ایک ہلچل سی پیدا کردے گی اس کا مجھے یقین ہے۔خدا کرے اُن کا افسانوی سفر اسی طرح جاری و ساری رہے! آمین۔



بکھرے رنگ

(افسانوں کا مجموعہ)

پیڑ کا جنّ

برکت علی کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم تھے، مگر گھر میں کسی ایم ڈی سے کم نہیں تھے...... ہر کام میں نقص نکالنا اپنی شان سمجھتے تھے...... گھر میں ان کا اتنا رعب تھا کہ جوں ہی وہ گھر میں داخل ہوتے ان کے ڈر کے سے گھر کا ماحول بدل جاتا اور گھر کے سبھی افراد آپس میں بات کرنے سے بھی کتراتے اور گھر میں سناٹے جیسا ماحول پسر جاتا۔ ایسے میں برکت علی اپنی بیوی رقیہ کو آواز لگاتے تو وہ سہمی ہوئی ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتی۔

ایک دن برکت علی کسی چیز کو تلاش کر رہے تھے۔ تلاش کرتے کرتے جب تھک گئے تو بیوی سے زوردار آواز میں پوچھا:

"میرا چشمہ کہاں ہے؟ میں اتنی دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم نے آخر کہاں رکھا ہے؟ ایک کام بھی تم ٹھیک طرح سے نہیں کرتی...... میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے...... میرے سامان کو ہاتھ نہ لگایا کرو اور ہاتھ لگانے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر اسے سامنے رکھا کرو...... لیکن تم ہو کہ کسی چیز کا خیال نہیں رکھتی۔"

اس طرح برکت علی نے ایک سانس میں رقیہ بیگم کو ڈانٹنا شروع کر دیا...... "تم بولتی کیوں نہیں؟ جواب دو؟ منہ میں زبان نہیں ہے کیا؟"

رقیہ بیگم نے ڈرتے ہوئے کہا:

"جی! چشمہ تو آپ کے سر پر ہے۔"

ٹھیک ہے آگے سے دھیان رہے۔ برکت علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

برکت علی کھانے کے بڑے شوقین تھے...... اور رقیہ بیگم شوہر کا شوق دیکھ کر بڑی محنت، مشقت اور محبت سے کھانا بناتی اور گن گن کر سارے مسالے کھانے میں ڈالتی اور دسیوں بار چکھتی کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے اور جب ان کے سامنے کھانا پیش کرتی تو برکت علی پہلا ہی لقمہ منہ میں ڈالتے ہی منہ بنا کر یہ کہتے ہوئے تھوک دیتے کہ یہ کیا کھانا بنایا ہے؟ اتنے سال

ہو گئے کھانا بناتے ہوئے ابھی تک تمہیں کھانا بنانا بھی نہیں آیا۔اس میں تو نمک ہی نہیں ہے۔ اور کھانا چھوڑ کر اٹھ جاتے۔ رقیہ بیگم برکت علی کی ان حرکتوں سے کافی پریشان تھی۔جب پریشانی زیادہ بڑھ گئی تو وہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ برکت علی کو کیسے راستے پر لایا جایا۔اچانک رقیہ بیگم کے زین میں ایک خیال آیا۔شاید یہی ایک راستہ تھا برکت علی کو سدھارنے کا۔

روزانہ کی طرح برکت علی آفس سے لوٹے اور رقیہ بیگم کو کڑک آواز میں پکارا''رقیہ! رقیہ! کہاں ہو؟''

برکت علی نے ادھر ادھر دیکھا لیکن حسب عادت رقیہ بیگم حاضر نہیں ہوئی۔ برکت علی کا پارہ چڑھ گیا اور رقیہ بیگم کو آواز لگاتے ہوئے سیدھے بیڈ روم کی طرف چل پڑے۔ دیکھا تو رقیہ بیگم بیڈ پر بیٹھی ہوئی جھوم رہی ہے۔

برکت علی خلاف توقع رقیہ بیگم کا رویہ دیکھ کر برس پڑے:

''رقیہ! یہ کیا تماشہ ہے؟''

رقیہ بیگم نے اپنی لال لال موٹی موٹی ڈراونی آنکھوں سے برکت علی کی طرف گھور کر دیکھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ کتنی دیر سے بلا رہا ہوں تمہیں ......سنائی نہیں دیتا؟ بہری ہوگئی ہو؟ چلو اٹھو اور جلدی سے میرے لئے چائے لیکر آو۔''

''خاموش!'' رقیہ بیگم نے زور سے کہا۔

''کیا! تم نے مجھے خاموش کہا؟ دماغ ٹھکانے پر تو ہے تمہارا؟''
غصے کے مارے برکت علی ابل پڑے۔

رقیہ بیگم فورا بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی ڈروانی آواز میں بولی: ''برکت علی۔۔۔۔!''

''کیا اب تم مجھے اب میرے نام سے پکاروگی؟...... میں تمہارا شوہر ہوں ...... تم یہ بھول گئی ہو؟ ابھی یاد دلاتا ہوں ......'' کہتے ہوئے برکت علی نے رقیہ بیگم کی چوٹی پکڑ کر پھنکار لگائی۔ ''نامعقول! تیری یہ مجال کہ تو اب میرے سامنے اونچی آواز میں بات کرے! ابھی تجھے ادب سکھاتا ہوں۔'' جونہی برکت علی نے رقیہ بیگم پر ہاتھ اٹھانا چاہا رقیہ بیگم نے برکت علی کو ایک زوردار دھکا دیا۔ برکت علی دور جا کر گرے اور رقیہ بیگم فورا برکت علی کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گی۔ تو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا! برکت علی، اب تیری خیر نہیں!

بیوی کا یہ روپ دیکھ کر برکت علی گھبرا گئے' اور ڈرتے ہوئے بولے ارے بیگم! یہ تم کیا کر رہی ہو؟ اور ہکلانے لگے کہ م......م...... میں تو مذاق کر رہا تھا...... روقو! رقیہ بیگم نے پھر ڈراونی آواز میں کہا...... میں تمہاری بیگم نہیں ہوں...... میں جن ہوں۔ اور تمہارے گھر کے سامنے والے پیڑ پر رہتا ہوں۔ بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں تم اپنی بیوی سے گھر

کا سارا کام بھی کرواتے ہواور اس پر ظلم بھی کرتے ہو...... اب میں تمہیں ہرگز نہیں چھوڑوں گا برکت علی!

برکت علی ڈر کے مارے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ مجھے چھوڑ دو! اللہ کے واسطے مجھے معاف کر دو۔ برکت علی گڑ گڑانے لگے ...... یہ حالت دیکھ کر رقیہ بیگم کے منہ سے نکل پڑا: ''مگر ایک شرط پر تمہیں چھوڑ سکتا ہوں......معاف کرسکتا ہوں ...... اگر تم وعدہ کرو کہ تم رقیہ بیگم کو آئندہ نہیں ستاؤ گے ......اور اب سے گھر کا سارا کام بھی تم خود کرو گے......

''برکت علی نے جلدی سے جواب دیا: ''مجھے منظور ہے، مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے......بس مجھے چھوڑ دو......'''' ٹھیک ہے میں جارہا ہوں ......لیکن یاد رہے سامنے والا پیڑ ہی میرا گھر ہے میں تمہاری ہر حرکت پر نظر رکھوں گا اگر تم نے وعدہ خلافی کی تو یاد رہے...... جن نے انگلی دکھاتے ہوئے کہا!''

اور یہ کہہ کر جن واپس چلا گیا۔

رقیہ بیگم ہوش میں آئیں تو دیکھا برکت علی ہاتھ جوڑے ان کے سامنے بیٹھے ہیں۔ رقیہ بیگم نے ڈرامہ کرتے ہوئے کہا '' میں کہاں ہوں؟ مجھے کیا ہوگیا تھا؟''

برکت علی نے بڑے پیار سے جواب دیا۔ کچھ نہیں بیگم تم کمزوری کی وجہ سے ذرا بے ہوش ہوگئی تھیں...... ایسا کرو تم یہاں بیڈ پر آرام کرو

میں تمہارے لئے جوس لیکر آتا ہوں...... یہ کہہ کر برکت علی کچن کی طرف چلے گئے ۔ رقیہ بیگم نے بڑے مزے سے میگزین ہاتھ میں اٹھایا اور اطمینان کی سانس لیکر مسکراتے ہوئے اس پیڑ کی طرف ایسے دیکھا کہ جیسے اس پیڑ کے جن کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔



بکھرے رنگ

سیما گھر میں اکیلی تھی......گھر کے سبھی لوگ باہر گئے تھے......
رات کا وقت تھا...... موسم بہت خراب تھا...... اندھیری رات میں بارش بہت تیزی سے ہو رہی تھی...... سیما اپنی پڑھائی میں مصروف تھی......
اچانک بادل زور سے گرجا......اور لائٹ کٹ گئی...... ابھی وہ کتابوں کو سمیٹ ہی رہی تھی کہ گھر کی پچھلی کھڑکی کے کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی......
سیما ڈر گئی...... لیکن وہ ہمت کر کے کانچ ٹوٹنے والے کمرے کی طرف

دھیرے دھیرے بڑھانے لگی۔کینڈل کی ہلکی روشنی میں اسے زیادہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔وہ گھبرائی ہوئی ہاتھ میں کینڈل لئے کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔سیما کو تبھی کوئی آہٹ محسوس ہوئی...... اسے پورا یقین ہوگیا تھا کہ کمرے میں کوئی ہے......کہ اچانک اسے ایک کالا سایہ نظر آیا...... اس سایے نے کالے کپڑے پہنے ہوئے تھے ......اور چہرے پر کالا ماسک لگایا ہوا تھا۔ڈر اور دہشت سے سیما کے پسینے چھوٹنے لگے ...... اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ک ک......ک......کون ہے وہاں؟ سامنے کیوں نہیں آتے؟ میں کہتی ہوں سامنے آؤ......تبھی پیچھے سے ایک ہاتھ اس کی طرف دھیرے دھیرے بڑھنے لگا...... سیما نے جونہی پیچھے مڑنا چاہا کہ ہاتھ نے اس کا منہ بند کر دیا۔سیما کے ہاتھ سے کینڈل زمین پر گرگئی ......اور چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا...... چاروں طرف اسے صرف اندھیرے کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دے رہا تھا...... سیما چیخنا چاہتی تھی......لیکن حلق سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی...... اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بہت کوشش کی......ہاتھ پیر مارے لیکن ہاتھ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اپنے آپ کو اس سے آزاد نہیں کر سکی......وہ ہاتھ سیما کو گھسیٹتے ہوئے بیڈروم کی طرف لے گیا......اور بستر پر پٹخ دیا۔سیما ابھی بھی اس سے آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہی تھی ......

کہ اس کی نظر ہاتھ کی انگوٹھی پر پڑی۔ وہ انگوٹھی کچھ عجیب تھی اس پر انسانی کھوپڑی کا نشان بنا ہوا تھا۔

سیما جب ہوش میں آئی تو اس نے اپنے کپڑوں کو پھٹا پایا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ دروازے پر دستک ہوئی...... سیما نے دروازہ کھولا تو ماں سامنے کھڑی تھی...... سیما اپنی ماں کے گلے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔

سیما کو روتے دیکھ کر ماں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے...... وہ بار بار پوچھ رہی تھی کہ سیما بیٹی کیا ہوا؟ تو کچھ بولتی کیوں نہیں؟ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے...... کچھ تو بول میری بچی...... کیا ہوا؟

سیما نے بھرے گلے سے پوری تفصیل ماں کے سامنے بیان کر دی۔ پاپا نے پولیس کو کال کرنا چاہا تو ماں نے جھٹ سے ان کے ہاتھ سے ریسیور فون پر رکھتے ہوئے کہا...... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ پولیس کو فون کرنے سے یہ بات پورے شہر میں پھیل جائے گی جو بات اس وقت گھر کی چہار دیواری میں ہے۔ اس میں ہماری اور ہماری بیٹی کی بدنامی ہوگی اسلئے ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم خاموش رہیں۔ اور سیما کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں سختی سے کہا۔

''سیما! خبردار یہ بات کبھی کسی کے سامنے کی تو۔'' اور صفائی ستھرائی

کر کے گھر کا ماحول ایسا بنا دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

دن گزرتے رہے...... ہر روز کی طرح سیما کالج جانے لگی کہ ایک دن جب وہ کالج سے لوٹی تو اس نے دیکھا کہ کچھ مہمان گھر میں آئے ہوئے ہیں۔

ماں نے سیما کو مہمانوں سے ملاتے ہوئے کہا:

''سیما یہ لوگ تمہیں دیکھنے آئے ہیں''۔ سیما یہ سنتے ہی شرماتے ہوئے فوراً اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

''میں دیکھتی ہوں''...... ماں نے کہا اور وہ بھی وہاں سے چلی گئی۔

''ماں یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا آپ نے ان لوگوں کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''بیٹی! جو ہوا سو ہوا۔ اسے اب بھول جا'' اور ماں نے اسے سمجھاتے ہوئے مزید کہا۔''خوش قسمتی دروازے پر دستک دے رہی ہے اور تو...... تو دروازہ بند مت کر...... خوشیوں کو آنے دے۔ میری بیٹی! شاید قدرت کو یہی منظور ہے۔''

''لیکن ماں...!''

''لیکن ویکن کچھ نہیں، میری بچی! آنسوؤں کو پونچھ ڈال اور بس...'' اتنا کہہ کر ماں اپنے آنسوؤں کو چھپاتے ہوئے کمرے سے

باہر نکل گئی۔

گھر میں شادی کا ماحول تھا۔ ہر طرف شور وغل تھا۔ ہنسی کے ٹھہاکے گونج رہے تھے۔ ہر طرف خوشی کا ماحول تھا۔

ماں نے سہیلیوں سے کہا ”ارے لڑکیو! سیما کو جلدی تیار کرو...... بارات آچکی ہے۔“

”موسی! آپ پریشان نہ ہوں ہم سب کرلیں گے۔ آپ جائیے اور مہمانوں کی دیکھ بھال کیجئے۔“ لڑکیاں کھلکھلاتے ہوئے سنگار روم میں چلی گئیں۔

لگن منڈپ سجا ہوا تھا۔ پنڈت منتر پڑھ رہا تھا:

”اوم سہاہا! اوم سہاہا“

”کنیا کو لے آئیے...... مہورت کا سمے بیت رہا ہے“۔

ماں سیما کو منڈپ میں لے آئی۔

پنڈت نے منتر پڑھنا شروع کیا۔ ور، ودھو پھیروں کے لئے کھڑے ہو جائیں...... کہتے ہوئے گھی آگ میں ڈالا۔

اب شادی سمپن ہوتی ہے۔ جائیے ماں باپ سے آشرواد لیجئے......

ماں نے سیما کو گلے سے لگایا اور اسکی پیشانی چومتے ہوئے کہا ”سدا سہاگن رہو میری بچی! دودھو نہاؤ پوتو پھلو“۔

اور ڈولی سسرال کے لئے روانہ ہوگئی۔

سسرال میں ساس نے ریتی رواج سے سیما کا سواگت کیا۔ اس کی نظر اتارنے کے لئے روپیوں کو وارتے ہوئے کہا کہ میری بہو کو کسی کی نظر نہ لگے اور اس نے نوکر کو کچھ روپئے دیتے ہوئے کہا کہ انھیں غریبوں میں بانٹ دینا۔

پھر لڑکیوں نے سیما کو گھیر لیا اور آپس میں ایک دوسرے کے کانوں میں کچھ کہتیں اور زور زور سے ہنسنے لگتیں......لڑکیوں میں سے ایک لڑکی نے کہا:

''بھابھی بہت سندر ہے''۔

تو دوسری نے کہا۔''آج نہ جانے ہمارے بیچارے بھیا کا کیا حال ہونے والا ہے؟''اور پھر سب زور سے ہنسنے لگیں۔

تھوڑی دیر میں ساس وہاں آئی اور لڑکیوں سے کہا:

''ارے لڑکیو! آج بھابھی کو ساری رات یہیں بیٹھائے رکھنا ہے کیا؟ جاؤ بہو کو اس کے کمرے میں لے جاؤ' تھک گئی ہوگی بیچاری''۔

ٹھٹھولیاں کرتے ہوئی لڑکیاں سیما کو کمرے میں لے گئیں اور بیڈ پر بیٹھا کر ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

سیما کمرے میں اکیلے بیٹھی سوچ میں غرق تھی کہ آنند کمرے میں

داخل ہوا۔ سیما سر جھکائے گھونگھٹ ڈالے خود کو سمیٹنے لگی۔ آنند بیڈ پر دھیرے سے بیٹھ گیا اور سیما سے کہا:

''سیما تم نہیں جانتی میں تم سے کالج کے پہلے دن سے محبت کرتا ہوں لیکن کبھی ہمت نہیں ہوئی تم سے کہنے کی مگر اب تمہیں پا کر آج میں بہت خوش ہوں۔ تم میری......''

بات کو کاٹتے ہوئے سیما بیڈ سے کھڑی ہو گئی...... اور کہنے لگی نہیں! میں آپ کے قابل نہیں ہوں! کہتے ہوئے زور سے رونے لگی۔

سیما تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟ آنند نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا سیما!

سیما اسکے ہاتھ کو کندھے سے ہٹاتے ہوئے بولی:

''میں سچ کہہ رہی ہوں! میں آپ کے قابل نہیں ہوں، میں آپ کو دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتی...... میں شادی سے پہلے ہی آپ کو بتانا چاہتی تھی لیکن ماں نے روک دیا...... اور یہ کہتے ہوئے سیما نے آپ بیتی آنند کو سنا دی۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد آنند سیما کے قریب گیا اور سیما سے کہا تم ابھی بھی پوتر ہو۔ تمہارے بے گناہ آنسوؤں نے تمہیں اور بھی پوتر کر دیا ہے۔

یہ سنتے ہی سیما آنند کے پیروں میں گر گئی۔ آنند نے سیما کو اٹھاتے ہوئے کہا ارے پگلی! پونچھ ڈالو ان آنسوؤں کو...... اور جو ہوا اسے بھول جاؤ...... آج ہماری سہاگ رات ہے نا...... اور ہماری نئی زندگی کی شروعات...... کہتے ہوئے آنند نے سیما کو گلے سے لگا لیا۔ من ہی من سیما اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش نصیب لڑکی تصور کرنے لگی اور دل ہی دل میں بھگوان کا شکر ادا کرنے لگی۔

آنند نے سیما کو بیڈ پر بٹھایا اور پانی کا گلاس آگے بڑھایا...... گلاس پکڑتے ہوئے جونہی سیما کی نظر آنند کی انگوٹھی پر پڑی تو گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر ٹوٹتے ہوئے سیما کے خواب رنگ ارمانوں کو بھی چکنا چور کر گیا۔



قاتل

گھپ اندھیری رات تھی...... ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا......
تیز وتند اور سرد ہوائیں سناٹے کو اور بھی بھیانک بنا رہی تھیں...... آسمان میں کالے گھنے بادل چھائے ہوئے تھے......بجلی چمک رہی تھی......موٹی موٹی بوندوں والی موسلا دھار بارش موسم کو سرد کر رہی تھی...... سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے تھے...... ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی......سدھا کیچن میں کھانا بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔

وہ نوکر سے کہہ رہی تھی:

"کاکا آج میں صاحب کی پسند کا کھانا بناؤں گی......تم تم اس بکرے کی ران کو merinate کر کے owan میں رکھو......تمہارے صاحب کو rosted ران بہت پسند ہے نا"۔ سدھا مسرت آمیز لہجے سے بولی۔

رامو نے برتن ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "جی بٹو رانی"! بہت اچھا......تبھی اچانک لائٹ چلی گئی۔

سدھا،"اف اس لائٹ کو بھی ابھی جانا تھا۔ اب یہ کینڈل نہ جانے کہاں ہے؟ سدھا نے سوچتے ہوئے الماری کی طرف ہاتھ بڑھایا، شکر ہے مل گئی۔ سدھا نے اطمینان کی سانس لی اور کینڈل کو جلایا اور تیزی سے رنبیر کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

رنبیر! رنبیر! سدھا نے آواز لگائی لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

بادل زور زور سے گرج رہے تھے...... بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی......سدھا کمرے کی طرف بڑھی۔ دروازے کو دھیرے سے push کیا اور اندر داخل ہوگئی...... سامنے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ کینڈل کی روشنی سے سدھا نے دیکھنے کی کوشش کی تو رنبیر ہاتھ میں سگار لئے صوفے پر بیٹھا تھا......سدھا نے پھر آواز دی رنبیر! رنبیر! کوئی جواب نہ ملنے پر وہ

دھیرے دھیرے اسکے قریب گئی اور ہلکے سے ہلاتے ہوئے رنبیر کو پکارا......تو رنبیر اچانک صوفے پر گر گیا۔ سدھا گھبرا گئی اور ایک زوردار چیخ سناٹے کو چیرتی ہوئی کمرے میں گم ہوگئی......

رامو چیخ سنتے ہی رنبیر کے کمرے کی طرف لپکا کہ تبھی اچانک لائٹ آ گئی۔ سدھا پتھر کی مورت بنی کھڑی ...... ہاتھ سے رنبیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پھٹی ہوئی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔

خو......خو......خون، خون چلاتے ہوئے رامو فون کی طرف دوڑا،

ہیلو! دوسری طرف سے آواز آئی۔

ص......ص......صاب ہم رامو بولت ہیں......آپ ایہاں جلدی چلے آئیے......ہمرے صاب کا کسی نے کھون کر دیا ہے" رامو نے روہانسی آواز میں کہا۔

سنسان سڑک پر سائرن بجاتی ہوئی پولیس کی گاڑی کچھ ہی پل میں رنبیر کے گھر کے سامنے رکی۔

ٹنگ ٹونگ! ڈوربیل بجی! کون ہے؟ روامو نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

پولیس انسپکٹر نے جواب دیا۔

آئیے صاب، اندر آئیے۔

انسپکٹر! لاش کہاں ہے؟

صاب لاش اوہاں اس کمرے میں ہے۔ راموں نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔

انسپکٹر نے کمرے کا راؤنڈ لیا اور راموں سے مین گیٹ بند کرواتے ہوئے کڑک آواز میں کہا'' گھر کے سبھی لوگ ایک طرف ہو جائیں اور کوئی بھی شخص کسی چیز کو چھونے اور چھیڑنے کی کوشش نہ کرے۔ آپ سبھی لوگ قاتل کو پکڑوانے میں ہمیں کواپریٹ کریں۔

پھر انسپکٹر نے سدھا کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا'' مسیز شرما گھر میں کتنے لوگ ہیں''۔

جی! میں، مرے husband اور ہمارا نوکر رامو۔

انسپکٹر نے باری باری سب سے سوال کیا؟

راموتم یہاں کتنے دنوں سے کام کر رہے ہو؟ انسپکٹر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا؟

صا، صا، صاب جی ہم ایہاں بیس برس سے کام کرت ہیں ...... رامو نے گھبراتے ہوئے جواب دیا۔

انسپیکٹر نے پھر سوال کیا۔'' تو تم مرڈر کے وقت کہاں تھے؟

صاب ہم اوہاں کیچن میں کام کرت رہے۔

’’جونہی بئو جی کی چیخ سنے ترنت صاب کے کمرے کی طرف دوڑے‘‘ رامو نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

اچھا! تو تم نے سب سے پہلے لاش دیکھی؟

جی صاب، نہیں صاب!

یہ جی صاب، نہیں صاب کیا لگا رکھا ہے؟ ٹھیک ٹھیک جواب دو! ورنہ! انسپکٹر نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

صاب جب ہم مالک کے کمرے میں گئے رہے تو دیکھا بئو جی وہاں موجود رہیں ہم تو صاب بئو کی چیخ سنکر ہی مالک کے کمرے کی طرف گئے رہے۔‘‘ رام کسم

ہوں! انسپیکٹر نے ایک لمبا کش لیا اور کچھ سوچتے ہوئے مسز شرما کی طرف دیکھا اور پوچھا؟

مسز شرما! آپ کی شادی کو کتنے سال ہوئے؟

مسز شرما نے ساڑی کے دامن کو ٹھیک کرتے ہوئے نظریں جھکائے جواب دیا ’’جی دس سال‘‘۔

انسپکٹر نے پھر پوچھا! کیا آپ بتا سکتی ہیں مسز شرما! کہ رنبیر صاب کی کسی سے کوئی دشمنی، کوئی تکرار؟

جی نہیں!

انسپکٹر سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر سدھا کے چہرے پر پڑی۔

''مسز شرما آپ کے سر پر یہ کیسی چوٹ کے نشان ہیں؟

جی! میں باتھ روم میں گر گئی تھی۔ سدھا نے آنکھ چراتے ہوئے جواب دیا۔

اسی بیچ رامو چائے لیکر آیا۔ ''صاب چائے''

انسپکٹر نے گرم چائے کا گھونٹ لیا اور سدھا سے پھر پوچھا؟

مسز شرما آپ اور آپ کے ہسبینڈ کے تعلقات کیسے تھے؟

جی تعلقات! کیسے ہونے چاہئے میاں بیوی میں؟ یہ کیسا سوال ہے؟

سدھا نے ذرا غصہ سے جواب دیا۔

پھر انسپکٹر لاش کی طرف گیا اور اگزامن کرتے ہوئے کہا:

''سر پر کسی بھاری چیز سے وار کرنے سے موت ہوئی ہے۔ حولدار کو بتاتے ہوئے کہا کہ اچانک انسپکٹر کی نظر صوفے کے نیچے چوڑی کے ٹکڑے پر پڑی۔ چوڑی کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے مسز شرما کی طرف انسپکٹر نے دیکھا اور کہا مسز شرما یہ چوڑی کا ٹکڑا آپ کی چوڑی کا تو نہیں؟ انسپکٹر نے شک کی نگاہوں سے مسز شرما کو دیکھا۔

سدھا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

انسپکٹر نے پھر پوچھا؟''مسز شرما کیا آپ بتا سکتی ہیں یہ ٹوٹی ہوئی چوڑی صوفے کے نیچے کیا کر رہی ہے؟ اور یہ یہاں کیسے آئی؟

انسپکٹر نے سختی سے پوچھا؟

جی! کانچ کی چوڑیاں ہیں کام کرتے ہوئے ٹوٹ گئی ہونگی۔ سدھا نے جھجھکتے ہوئے جواب دیا۔

کانچ کی چوڑیاں ٹوٹ ہی جاتی ہیں لیکن کب اور کیسے؟ انسپکٹر نے سدھا کی بات کو دہراتے ہوئے کہا۔

مسز شرما! ثبوت آپ کے خلاف ہیں۔ خوبصورت اور جوان ہونے کے باوجود مسٹر شرما کو آپ میں دلچسپی نہیں تھی۔ ہر روز کی طرح مسٹر شرما نے اس دن بھی زیادہ پی ہوئی تھی اور نشے کی حالت میں انھوں نے آپ پر ہاتھ اٹھایا اور آپ نے کسی بھاری چیز سے ان کے سر پر وار کیا۔ اور نتیجہ! انسپکٹر نے لمبی سانس لی اور بات کو پوری کرتے ہوئے پھر کہا نتیجہ! آپ کے سامنے ہے'' مسٹر شرما کی موت!

نہیں یہ جھوٹ ہے۔ میں نے رنبیر کا خون نہیں کیا۔

سدھا نے چلاتے ہوئے جواب دیا۔

چلائیے مت! مسز شرما، خون آپ ہی نے کیا ہے۔

اسی بیچ رامو کمرے میں داخل ہوا:

"صاب کھانا ٹیبل پر لگا دیئے ہیں۔ چلئے صاب کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا"۔

ٹرے میں روسٹڈ ران سجی رکھی تھی۔ انسپکٹر ڈائننگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گیا اور پلیٹ میں روسٹڈ ران کا گوشت لیا اور چھری سے کاٹتے ہوئے کانٹے سے گوشت کے پیس کو منہ کی طرف بڑھایا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا اور دھیرے دھیرے بڑبڑانے لگا:

"خون تو مسز شرما نے ہی کیا ہے اور ثبوت بھی یہیں کہیں موجود ہے لیکن کون سا ثبوت؟ کیا ثبوت ہوگا؟ اور گوشت کے پیس کو منہ میں ڈال لیا۔

مسز شرما ڈائنگ روم کے دروازے پر کھڑی اپنے جرم کو ختم ہوتے دیکھ کر من ہی من میں مسکرا رہی تھی۔



طلاق

"پری آج تم پھر دیر سے آئیں...... مجھے تمہارا دیر سے آنا بالکل اچھا نہیں لگتا...... جانتی ہو میں ایک گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" شاداب نے غصے سے کہا۔

"اچھا بابا سوری...... دیکھو میں کان پکڑتی ہوں...... اب آئندہ دیر سے نہیں آؤں گی۔۔۔۔لیکن سنو! تمہارا یہ غصہ کرنے کی عادت ٹھیک نہیں ہے...... ذرا ذرا سی بات پر تم اتنا غصہ کرتے ہو...... غصہ تو جیسے

تمہارے ناک پر رکھا ہے۔" پری نے شاداب کی ناک پر شوخی سے انگلی کرتے ہوئے کہا اور دونوں ہنس دیئے۔

"دیکھو پری مجھے غصہ ذرا زیادہ ہی آتا ہے کیا تم میرا ہر حال میں ساتھ دوگی۔" شاداب نے ذرا مایوسی سے پوچھا؟

"کیوں نہیں! میں زندگی کے ہر موڑ پر تمہارا ساتھ دوں گی۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔" پری نے پوچھا؟ "اور ہاں کیا تم نے اپنے گھر والوں سے بات کی؟"

"کون سی بات؟"

"ارے وہی ہماری شادی کی بات۔"

"ہاں! کی تھی لیکن گھر والے راضی نہیں ہیں۔"

"اور کیا تم نے اپنے گھر والوں سے بات کی۔" شاداب نے بھی پری کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! لیکن وہ بھی راضی نہیں ہیں۔"

"تو کیا ہم اب جدا ہو جائیں گے۔ شاداب! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔" پری نے روہانسی آواز میں کہا۔

"اچھا! تو اب بس ایک ہی راستہ ہے۔ اگر تم راضی ہو تو! کون سا راستہ؟" پری نے پوچھا؟

''کورٹ میریج!'' شاداب نے کہا

''کورٹ میریج!'' پری نے دہراتے ہوئے کہا۔

''ہاں کورٹ میریج!'' شاداب نے ذرا زور لگا کر کہا۔

پری نے کچھ دیر سوچا اور کہا اگر کورٹ میریج ہی ہمارے ملن کا راستہ ہے تو یہی ہی سہی۔ میں تیار ہوں۔

''ٹھیک ہے کل ہم کورٹ میریج کریں گے۔'' شہاب نے کہا

''او شاداب آئی لو یو'' کہتے ہوئے پری شاداب کے گلے لگ گئی۔

شادی کے بعد دونوں بمبئی شفٹ ہو گئے۔

شاداب نے نوکری کے ساتھ بلڈنگ میں فلیٹ رینٹ پر لے لیا۔ بلڈنگ کے اوپر والے فلیٹ میں ایک بزرگ رہتے تھے جنھیں سب رحمت چاچا کہتے تھے۔ رحمت چاچا نمازی پرہیزگار اور نیک انسان تھے۔......ان کی بیوی دس سال پہلے گزر چکی تھی...... اور بچے امریکہ میں سیٹلڈ تھے۔......رحمت چاچا اپنے اس فلیٹ میں اکیلے رہتے تھے...... شاداب اور پری سے بھی رحمت چاچا کی اچھی جان پہچان ہوگئی تھی...... شاداب اور پری اکثر رحمت چاچا کے پاس آتے جاتے تھے ...... رحمت چاچا ان کو دین کی باتیں بتاتے...... دنیا اور آخرت کی باتیں سمجھاتے۔ اور نیک راستے پر چلنے کی ترغیب دیتے۔

پری نے نوکری کے لئے جو انٹرویو دیا تھا اس کی سلیکشن کی خوش خبری وہ شاداب کو سنانا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ خوشی سے دوڑتے ہوئے گھر آ رہی تھی کہ شاداب کو بتائے گی کہ اسے نوکری مل گئی...... مارے خوشی کے اس کے پیر زمین پر ہی نہیں پڑ رہے تھے...... جیسے تیسے وہ گھر پہنچی تو دیکھا شاداب اس کا غصے میں انتظار کر رہا ہے۔

''کہاں گئی تھی میری اجازت کے بغیر؟ کس یار سے ملنے گئی تھی؟ بتا؟'' شاداب نے غصہ سے کہا۔

شاداب تم کیسی بات کر رہے ہو؟

میں! میں! اور پری نے اس سے کچھ کہنا چاہا لیکن شاداب نے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

اور پھر شاداب نے غصہ سے پری کا ہاتھ زور سے جھٹکا...... اور چیختے ہوئے کہا۔ کس سے پوچھ کر تم نے نوکری کے لئے اپلائی کیا تھا؟

پری نے ڈرتے ہوئے کہا، ش، ش، شاداب!

''چپ رہو!'' شاداب اور زیادہ غصہ میں چیخنے لگا۔'' جاؤ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ طلاق! طلاق! طلاق!''

پری نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا نہیں شاداب! خدا کے واسطے مجھے گھر سے مت نکالو۔ کہتے ہوئے پری بے ہوش ہوگئی...... اور جب

ہوش میں آئی تو اس نے دیکھا کہ شاداب ایک کونے میں بیٹھا اپنے سر کو پکڑے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے...... یہ میں نے کیا کر دیا؟...... یہ مجھ سے کیا ہوگیا؟...... اب میں کیا کروں؟...... کس سے کہوں؟...... کس کے پاس جاؤں؟...... کہتے ہوئے پری کے گھٹنوں پر سر رکھنا چاہا۔

"نہیں! مجھ سے دور رہو! اب میں تمہارے لئے غیر ہو چکی ہوں۔ مجھے مت چھوؤ۔"

"نہیں پری ایسا مت کہو! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔" شاداب مسلسل رو رہا تھا۔

"لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہمارا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔" پری نے روتے ہوئے کہا۔

"نہیں میری پیاری پری! ایسا مت کہو۔ مجھے صرف ایک موقع دو...... میں تمہاری قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں بدل جاؤں گا۔ میں کبھی تم پر غصہ نہیں کرونگا۔"

"لیکن اب کیا ہو سکتا ہے شاداب؟ تم نے تو سارے دروازے ہی بند کر دیئے۔"

"اب کوئی راستہ نہیں ہے جو مجھے تم تک پہنچا سکے۔"

"اچھا! اچھا! ایک راستہ ہے...... چلو رحمت چاچا کے پاس چلتے

ہیں...... اس مسئلے کا حل وہی بتا سکتے ہیں۔"

"ٹھ...... ٹھ...... ٹھیک ہے......"شاداب رحمت چاچا کا دروازہ زور زور سے پیٹنے لگا۔

"ارے بھئی کون ہے؟ دروازہ توڑ ہی ڈالو گے کیا؟"

رحمت چاچا نے جلدی سے دروازہ کھولا...... ارے میاں! تو تم ہو ...... بھئی یہ دروازہ توڑنے کی کیا سوجھی؟ کہو خیریت تو ہے نا؟ رحمت چاچا نے اپنے چشمے کو اپنی لنگی سے صاف کیا اور آنکھوں پر لگاتے ہوئے کہا۔

چاچا خیریت ہی تو نہیں ہے......شاداب نے جلدی جلدی جواب دیا۔ اچھا بھئی چلو اندر...... اطمینان سے بیٹھو! اور بتاؤ کیا پریشانی ہے۔

چاچا! چاچا! کہتے ہوئے شاداب نے پوری تفصیل بیان کر دی۔

رحمت چاچا نے غور سے سوچا اور کہا:

"برخوردار معاملہ تو بہت پیچیدہ ہے...... ہوں! تو اب تو کچھ نہیں ہوسکتا۔ تین طلاق واقع ہو چکی ہے۔

"نہیں چاچا! خدا کے واسطے ہماری مدد کرو......کوئی راستہ بتاؤ؟ ہم بہت امید سے آپ کے پاس آئیں ہیں۔" شاداب نے چاچا کے پیر پکڑ لئے۔

اچھا ہاں! ایک راستہ ہے۔

چاچا جلدی بتائیے شاداب نے کہا۔ وہ کون سا راستہ ہے؟

میاں راستہ بہت مشکل ہے چاچا نے کہا۔

چاچا میں اپنی پری کے لئے مشکل سے مشکل راستہ طے کرنے کو تیار ہوں۔

آپ! آپ بس بتائیے مجھے کیا کرنا ہے؟

اچھا میاں اگر تم اتنا ہی ضد کرتے ہو تو وہ راستہ ہے حلالہ!

حلالہ! شاداب نے دہراتے ہوئے کہا۔

ہاں حلالہ! تمہاری بیوی کو پہلے کسی اور مرد سے شادی کرنی ہوگی اور پھر جب وہ مرد تمہاری بیوی کو طلاق دے گا تو تب کہیں جا کر تم اپنی بیوی سے دوبارہ شادی کر سکو گے۔

لیکن چاچا! میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو میری مدد کر سکے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے شاداب نے چاچا کی طرف دیکھا اور کہا چاچا کیا آپ میری پری سے ایک رات کے لئے شادی کریں گے۔

نہیں میاں! میں بزرگ آدمی اب کہاں شادی وادی کروں گا۔

چاچا نے ذرا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

نہیں چاچا! آپ میری مدد کریں۔ بس ایک رات کی ہی تو بات ہے۔

چاچا پلیز میری مدد کیجیے۔ میں زندگی بھر آپ کا یہ احسان نہیں بھولوں گا۔

اچھا میاں...... اگر تم اتنی ہی ضد کر رہے ہو تو میں تیار ہوں...... یہ کہتے

ہوئے چاچا نے موٹی موٹی آنکھوں کو لالچ سے گھمایا...... اور ہونٹوں پر زبان کو پھیرا...... اور چہرے پر عجیب سی خوشی ظاہر ہونے لگی...... مانو بڑھاپے پر جوانی آ گئی ہو......اور پھر سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا...... اچھا اگر تم اتنی ضد کر رہے ہو تو میں تیار ہوں......صرف تمہارے لئے۔

فوراً مولوی کو بلا کر نکاح پڑھوایا گیا۔

اچھا تم اب ایسا کرو۔ جاؤ گھر اور آرام کرو۔ چاچا نے شاداب کو ٹرخاتے ہوئے کہا۔

رحمت چاچا میں کل صبح آؤں گا۔ شاداب نے بڑی عاجزی سے چاچا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

ہاں بھئی! صبح آ جانا! اب جاؤ رات کافی ہو چکی ہے۔ کہتے ہوئے چاچا نے دروازہ بند کر دیا۔

شاداب اپنے بستر پر لیٹ کر بے چینی سے کبھی اس طرف کروٹ لیتا اور کبھی اس طرف۔ لیکن اسے کس کروٹ چین نہیں آ رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ صدیوں کی طرح گذر رہا تھا۔ جیسے تیسے کر کے رات کٹی اور فجر کی اذان ہوئی تو شاداب دوڑتے ہوئے رحمت چاچا کے فلیٹ پر گیا۔ اور زور زور سے ڈور بیل بجانے لگا۔ اندر سے کسی خاتون کی آواز آئی۔ ارے کون ہے؟ اتنی صبح کون آ گیا۔ کہتے ہوئے خاتون نے دروازہ کھولا۔ تو شاداب

اسے ایک طرف کرتے ہوئے فلیٹ میں رحمت چاچا، رحمت چاچا پکارتے ہوئے گھس گیا...... لیکن رحمت چاچا کہیں نظر نہیں آئے...... تو عورت سے پوچھا رحمت چاچا؟

ارے کون رحمت چاچا! کہیں تم اس بوڑھے کی بات تو نہیں کر رہے ہو جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی؟

ہاں! میں انھیں کی بات کر رہا ہوں۔ وہ کہاں ہیں؟ جلدی بتاؤ نا؟

وہ تو رات ہی فلیٹ چھوڑ کر چلے گئے۔

چلے گئے! لیکن کہاں؟ کیوں؟

بھئی پتہ نہیں۔ کہاں گئے؟ کہہ رہے تھے بیگم کو لے کر دوسرے شہر جا رہا ہوں اب وہیں رہیں گے۔



فریب

رمیش! رمیش! پتا نہیں یہ لڑکا کہاں ہے؟ پڑھنے لکھنے میں تو اسکا دل لگتا نہیں ۔......سارا سارا دن آوارہ گردی، سینما...... اور سب سے چھوٹا تو موبائل پر...... فیس بک پر فرینڈس سے چیٹنگ کرتا رہتا ہے......

ماں نے اس پر ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

لیکن رمیش تو گھر میں ہے ہی نہیں ...... شاید فرینڈز کے ساتھ مووی دیکھنے گیا ہوگا......

رمیش کے پاپا! میں کہتی ہوں رمیش پر سختی نہ برتی گئی تو وہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ مدھو نے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

اچھا! آنے دو آج اسے میں ٹھیک کرتا ہوں۔ رمیش کے پاپا نے اخبار کا پنا پلٹتے ہوئے کہا۔

دروازے کی گھنٹی بجی ٹرن، ٹرن، شیلا نے جلدی سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا کہ چھوٹے بابو آ گئے اور کچن میں چلی گئی۔

رمیش! اتنی دیر کہاں لگا دی؟ پاپا نے ڈانٹتے ہوئے پوچھا؟

ارے ڈیڈ! آپ کو تو معلوم ہی ہے...... یو نو آئی واز ود مائی فرینڈز...... اور وہ نشے کی حالت میں جھومتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

مدھو اپنا سر ہاتھ سے پکڑ کر بیٹھ گئی اور روتے ہوئے کہا بھگوان کسی دشمن کو بھی ایسا نالائق بیٹا مت دینا۔

اتنے میں شیلا ٹرے میں کھانا لیکر آئی، میم صاب چھوٹے بابو کا کھانا!

لا، مجھے دے مدھو نے شیلا کے ہاتھ سے کھانے کی ٹرے لیتے ہوئے کہا۔

مدھو ٹرے لیکر رمیش کے کمرے میں گئی تو رمیش بستر پر نشے میں

چور اوندھا پڑا ہوا تھا۔

مدھو نے اس کے جوتے اتارتے ہوئے کہا:

کھانا تو کھالے ۔۔۔بیٹا۔۔۔ پتا نہیں دن میں کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں؟

آخر کوئی جواب نہ ملنے پر مدھو اسکے کمرے کی لائٹ آف کر کے باہر چلی گئی...... اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکاتے ہوئے بولی...... اجی سنئے ہم سے کون سی غلطی ہوگئی جس کی سزا ہمیں اس بیٹے کے روپ میں مل رہی ہے؟

آکاش نے مدھو کو گلے سے لگا لیا اور اسکو دلاسہ دیتے ہوئے بولا: گھبراؤ نہیں...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اگلی صبح دروازے پر پھر دستک ہوئی...... مدھو نے دروازہ کھولا تو دیکھا ان کے پڑوسی مسٹر گپتا غصے میں کھڑے ہیں۔

"ارے گپتا جی آپ؟" مدھو نے مسکراتے ہوئے کہا "بہت دنوں کے بعد آئے ہیں؟"

کہئے کیسے ہیں آپ؟ یہ پوچھتے ہوئے مدھو نے انھیں بیٹھنے کے لئے کہا۔

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا ہوں۔"

"گپتا جی کیا ہوا؟ آپ اتنے غصے میں کیوں ہیں؟"

''کہاں ہے رمیش؟'' گپتا جی نے غصہ میں پوچھا؟

''جی ابھی وہ سو رہا ہے۔'' مدھو نے جواب دیا۔

''سو رہا ہے! ہماری نیند اڑا کر وہ کمبخت سو رہا ہے؟''

''آخر ہوا کیا؟ گپتا جی کچھ تو بتائیے؟'' مدھو تھوڑا پریشان ہو کر پوچھ بیٹھی۔

''سمجھا لیجئے اپنے بیٹے کو ورنہ پولیس کے حوالے کر دوں گا۔''

''اوہ گپتا جی آپ بتاتے کیوں نہیں ہوا کیا ہے؟''

''شور سن کر رمیش اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔''

پوچھئے اپنے سپوت سے! آئے دن میری لڑکی کا راستہ روکتا ہے...... گندی گندی باتیں کرتا ہے...... آخری وارنگ دے رہا ہوں...... ورنہ پولیس کے حوالے کر دوں گا...... آئندہ میری بیٹی کو چھیڑنے یا پریشان کرنے کی کوشش کی تو...... انگلی دکھاتے ہوئے گپتا جی نے وارنگ دی...... اور یہ کہہ کر گپتا جی واپس ہو لئے۔

مدھو سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ بس ایک یہی کسر باقی تھی...... اب تو پڑوسی بھی انگلی دکھاتے ہیں...... بھگوان سے اسی دن کے لئے تجھے مانگا تھا...... ایسے نالائق بیٹے سے تو اچھا تھا بھگوان مجھے بے اولاد ہی رکھتا...... کہتے ہوئے مدھو اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھنے لگی۔

دن بیتتے گئے ۔ایک دن مدھو نے شیلا کو الٹی کرتے دیکھا۔شیلا! شیلا! کیا ہوا تجھے؟ مدھو نے شیلا کو غور سے دیکھا تو شیلا سہم گئی ۔کچھ نہیں کچھ نہیں...... کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی...... مدھو بھی پیچھے پیچھے اسکے کمرے میں گئی۔اور بار بار پوچھنے پر شیلا مالکن! مالکن! کہہ کر مدھو کے پیروں میں گرگئی۔مجھے بتا پگلی کس کا بچہ ہے؟

شیلا زور زور سے رونے لگی۔میں جانتی ہوں آخر یہ کارستانی کس کی ہے۔ہمارا تو منہ کالا کر دیا اس لڑکے نے ۔کہتے ہوئے مدھو تیز تیز قدموں سے رمیش کے کمرے میں داخل ہوئی اور ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔نالائق! آخر تو میری کوکھ میں ہی کیوں نہیں مرگیا؟ تیری وجہ سے آج یہ دن دیکھنے کو تو نہیں ملتا؟

”لیکن ماں میں نے اب کیا کیا؟“

”شرم نہیں آتی پوچھتے ہوئے تو نے کیا کیا؟ آج جو تو نے کیا وہ کوئی دشمن بھی نہیں کرتا۔“

”لیکن مجھے بتائیے تو کہ اب کون سی غلطی ہوئی؟“

”تو سننا چاہتا ہے؟“ مدھو غصے سے تلملا کر اٹھی ”سن شیلا پیٹ سے ہے۔“

”ماں تیری سوگندھ میں اسکا ذمہ دار نہیں ...... ماں میری بات پر یقین کرو۔“

''مت لے میرا نام اپنی گندی زبان سے ۔آج تو نے میرا سر شرم سے نیچا کر دیا۔''

میں کیا جواب دوں گی اس کی ماں کو......جس نے مجھ پر بھروسہ کر کے شیلا کو میرے ساتھ گاؤں سے یہاں بھیج دیا......میں اس یتیم بچی کو سہارا دینے کے لئے گاؤں سے اپنے پاس لائی تھی......آج تیری وجہ سے بے چاری بے سہارا ہوگئی۔اب میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کس سے کہوں؟

کہتے ہوئے شیلا کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

ابھی کمرے تک پہنچی ہی تھی کہ کچھ آوازیں سن کر دروازے کے باہر ہی رک گئی اور کان لگا کر سننے لگی۔

میری جان! تم گھبراؤ نہیں ۔میں نے کب انکار کیا ہے کہ یہ بچہ میرا نہیں۔ یہ بچہ میرا ہے ۔مدھو کو اس بات کا کبھی پتا نہیں چلے گا۔میں تم سے ضرور شادی کروں گا۔

مدھو نے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو شیلا آکاش کی بانہوں میں رو رہی تھی اور آکاش اسکے چہرے کو سہلا رہا تھا۔



آخر میں نے پالیا تجھے

ندیم بھائی کی حالت میں کوئی سدھار نہیں ہو رہا تھا......
بڑے بڑے ڈاکٹروں علاج کروانے کے باوجود بیماری پکڑ میں نہیں آ رہی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب میرے بیٹے کو کیا ہوا ہے؟ دیکھیے کتنا کمزور ہو گیا ہے؟'' ابا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''شیخ صاحب! ہم جتنی کوشش کر سکتے تھے ہم نے کی۔ اب دعا کا

ہی سہارا ہے...... دعا کیجئے اور بیٹے کو گھر لے جائیے۔" ڈاکٹر یہ کہہ کر روم سے باہر چلا گیا۔

ندیم بھائی کو ہسپتال سے گھر لایا گیا۔ پاس پڑوس والے ندیم بھائی کی عیادت کے لئے آتے رہتے اور افسوس کر کے چلے جاتے۔

ایک دن ہمارے پڑوسی مرزا صاحب ندیم بھائی کو دیکھنے آئے۔ انھوں نے ابا سے کہا:

"شیخ صاحب آپ کسی پیر فقیر کو کیوں نہیں دکھاتے؟"

"میں پیر فقیر کو نہیں مانتا۔" ابا نے جواب دیا۔

"لیکن ایک بار دکھانے میں کوئی حرج نہیں ہے...... اگر آپ کہیں تو میرے جاننے والوں میں سے ایک صاحب ہیں جو اس طرح کا علاج کرتے ہیں...... اگر آپ چاہیں تو میں ان سے بات کروں؟"

"آپ کو اگر اتنا زور دے رہے ہیں اور آپ کو اتنا بھروسہ ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"ٹھیک ہے میں کل ہی ان کو اپنے ساتھ لیتا آؤں گا۔"

اگلی صبح دروازے کی گھنٹی بجی۔ ابا نے جلدی سے دروازہ کھولا تو دیکھا سفید لمبی داڑھی...... لمبا لباس...... سر پر سفید پگڑی...... اور ہاتھ میں تسبیح لئے ایک شخص مرزا صاحب کے ساتھ دروازے پر کھڑے تھے۔

یہ پیر سبحان ہیں۔ مرزا صاحب نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

اندر آئیے۔ ابا ان کو ندیم بھائی کے کمرے کی طرف لے گئے۔

پیر صاحب نے پورے گھر کا جائزہ لیا اور واپس آ کر ندیم بھائی کے پاس بیٹھ گئے۔

''ہاں! تو بیٹا آپ کا نام کیا ہے؟''

''ندیم!''

''اور ماں کا نام؟'' پیر صاحب نے پھر پوچھا:

''رقیہ بیگم!''

ٹھیک ہے۔ کہتے ہوئے پیر صاحب نے کچھ حساب لگایا اور کہا شیخ صاحب بیٹے پر تو کسی اوپری چیز کا سایہ ہے۔

پیر صاحب میرے بیٹے کو کسی بھی طرح ٹھیک کر دیجئے میں زندگی بھر آپ کا احسان نہیں بھولوں گا...... ابا نے گڑگڑاتے ہوئے بہت عاجزی سے کہا...... ٹھیک ہے پیر صاحب نے جواب دیا۔

لیکن مجھے اس چیز کو حاضر کرنا پڑے گا...... پیر صاحب نے ابا سے پوچھا۔

آپ جیسا ٹھیک سمجھیں۔

تو ٹھیک ہے۔

بیٹا اپنا ہاتھ دو۔ اور پیر صاحب نے ندیم بھائی کا ہاتھ اپنے ہاتھ

میں لیا اور آنکھ بند کر کے کچھ بدبدانے لگے۔

تبھی ندیم بھائی نے پیر صاحب سے اپنا ہاتھ چھڑا یا۔ اور زور زور سے جھومنے لگے۔ آنکھیں لال ہوگئیں اور ڈراونی آواز میں کہنے لگے مجھے کیوں بلایا ہے؟

پیر صاحب نے سوال کیا:

"بتا تو کون ہے؟ نہیں بتائے گا تو میں تجھے جلا دوں گا۔"

"نہیں، نہیں ایسا مت کرنا۔ میں بتاتی ہوں۔ پہلے وعدہ کرو کہ مجھے چھوڑ دوگے۔"

"ہاں! چھوڑ دوں گا۔" پیر صاحب نے کہا

ا"چھا تو سنو! میں ایک جنی ہوں۔ میں ندیم کا برا نہیں چاہتی۔

میں ندیم سے محبت کرتی ہوں اور بس ہمیشہ ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

ندیم بھائی نے جھومتے ہوئے جواب دیا۔

"اے جنی! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" پیر صاحب نے غصہ میں جواب دیا۔"اچھا بتا تو ندیم کو کہاں ملی؟"

ندیم چھ مہینے پہلے اپنے ابا اور گھر والوں کے ساتھ گاؤں آئے تھے اور وہ شاید گاؤں گھومنے نکلے تھے...... تبھی انھیں ایک بکری کا بچہ پانی میں بہتا ہوا دکھائی دیا...... انھوں نے صرف ایک بکری کے بچے کے

لئے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر اس بچے کو بچالیا......اور وہ بکری کا بچہ میں تھی......تبھی سے میں ان سے محبت کرتی ہوں اور اب کوئی بھی دنیا کی طاقت مجھے ندیم سے الگ نہیں کرسکتی......آپ بھی پیر صاحب!

''دیکھ لڑکی! تو ندیم کا پیچھا چھوڑتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ تجھ جیسی خبیث روح کو ٹھیک کرنا میں اچھی طرح جانتا ہو۔'' شیخ صاحب ہاتھ میں تسبیح گھماتے سرخ آنکھوں سے دھمکایا۔

''میں پہلے بھی آپ سے کہہ چکی ہوں۔ میں ندیم سے محبت کرتی ہوں اور اسکے ساتھ ہمیشہ رہنا چاہتی ہوں میں کبھی بھی ندیم کو نہیں چھوڑوں گی۔''

''اچھا! اگر تیری یہی ضد ہے تو دیکھ میں تجھے ابھی جلا دیتا ہوں۔''

پیر صاحب نے ہاتھ میں راکھ اٹھائی اور آگ میں ڈال دیا

''نہیں! نہیں مجھے مت جلاؤ، میں ندیم سے محبت کرتی ہوں۔''

''اے لڑکی میں آخری بار کہتا ہوں۔ میری بات مان جا ورنہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔''

''ٹھیک ہے! پیر صاحب اس وقت تو میں جاتی ہوں لیکن میں ایک نہ ایک دن ندیم کو پا کر ہی رہوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔'' کہتے ہوئے جنی غائب ہوگئی۔

جنی کے جاتے ہی ندیم بھائی زمین پر گر پڑے۔ پیر صاحب نے ندیم بھائی کو اٹھایا اور پانی کے گلاس میں کچھ دم کر کے ندیم بھائی کے منہ پر چھڑک دیا اور تھوڑی دیر میں ندیم بھائی ہوش میں آ گئے۔

ابا نے فورا ندیم بھائی سے پوچھا۔"بیٹا اب طبیعت کیسی ہے؟ کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"مجھے کیا ہوا تھا؟ اور میں کہاں ہوں؟" ندیم بھائی نے دھیرے سے پوچھا؟

"بیٹا! تم اپنے گھر میں ہو اور اب ٹھیک ہو۔" کہتے ہوئے ابا کی آنکھوں سے خوشی کے آنسوؤں چھلک پڑے۔

"ندیم بیٹا اب طبیعت کیسی ہے؟" پیر صاحب نے پوچھا

"اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔" پیر صاحب مسکرائے۔

ابا نے پیر صاحب کا ہاتھ پکڑ کر رو رو کر شکریہ ادا کیا۔

"کوئی بات نہیں۔" پیر صاحب نے کہا "لیکن یہ کچھ تعویذ یں ہیں جنھیں ہر روز ندیم کو پلانا ہے۔ بس باقی سب اللہ ٹھیک کرے گا۔"

یہ کہہ کر مرزا صاحب کے ساتھ پیر صاحب نکل گئے۔

ندیم بھائی کی صحت میں دن بہ دن سدھار ہو رہا تھا۔ چہرے پر رونق بھی آنے لگی۔ اور کچھ دنوں کے بعد وہ کام پر بھی جانے لگے۔ ندیم

بھائی کی زندگی میں جیسے بہار کا موسم آنے لگا۔ایک دن ندیم بھائی کی ملاقات آسیہ سے ہوئی۔آسیہ بہت خوبصورت تھی۔اس لیے ندیم پہلی ہی ملاقات میں اپنا دل ہار بیٹھا۔اور آسیہ کے ساتھ ملاقات کا سلسلہ بڑھنے لگا۔

''آسیہ تم رہتی کہاں ہو؟''

''وہ جو بلڈنگ دیکھ رہے ہو نا۔اس میں تیسری منزل پر میرا فلیٹ ہے۔میں یہاں اپنے ماموں کے ساتھ رہتی ہوں۔ماں باپ تو بچپن میں ہی گزر گئے تھے،ماموں نے پال پوس کر مجھے بڑا کیا۔''

''تم اپنے ماموں سے کب ملوانے لے چلوگی؟'' ندیم نے پوچھا

''یہ تو مشکل ہے،میرے ماموں پرانے خیالات کے ہیں۔وہ یہ سب باتیں پسند نہیں کرتے۔'' آسیہ نے پھر جواب دیا۔اور مجھ سے وعدہ کرو ندیم کہ تم کبھی میرے گھر آنے کی ضد کبھی نہیں کروگے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' ندیم نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور کہا تم جانتے ہو ندیم! اگر میرے ماموں کو تمہارے اور میرے رشتے کے بارے میں پتا چلا تو وہ کبھی مجھے معاف نہیں کریں گے۔'' آسیہ نے بہت فکرمندی سے کہا؛

''اور مجھے تم سے جدا ہونا پڑے گا۔اور میں تم سے کبھی جدا نہیں ہونا چاہتی۔''

''ٹھیک ہے میں اب کبھی تم سے ضد نہیں کروں گا۔ اور میں بھی تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔''

''او ندیم!'' کہتے ہوئے آسیہ ندیم سے لپٹ گئی۔

شام کو ندیم جب گھر پہنچا تو گھر کے سبھی لوگ ندیم کو دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ ندیم کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گھر میں آخر اتنی چہل پہل اور خوشیاں کیوں ہیں۔

تبھی ابا نے ندیم کو بلایا۔ ندیم بیٹا!

''جی ابا''

''برخوردار یہاں ہمارے پاس آ کر بیٹھو۔'' ابا نے اخبار کو ٹیبل پر رکھا اور چشمہ کو اتارتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری امی کہہ رہی ہیں کہ گھر بہت سونا سونا لگتا ہے۔''

''کیا مطلب میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''بیٹا تمہاری امی اب گھر میں بہو چاہتی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''جی! کہتے ہوئے ندیم شرما گیا۔ شرم سے گال تمتما اٹھے۔''

''اچھا تو یہ بتاؤ شادی ہماری پسند سے کرنا ہے یا تمہاری کوئی پسند ہے؟''

''ابا! آسیہ۔''

''آسیہ؟ بھئی یہ آسیہ کون ہے؟'' ابا نے پوچھا۔

''آسیہ کو میں پچھلے چھ مہینے سے جانتا ہوں ...... ہمیں ملے چھ مہینے ہی ہوئے ہیں...... لیکن جب میں آسیہ سے ملتا ہوں پتا نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اسے سالوں سے جانتا ہوں۔''

''اچھا اگر ایسی بات ہے تو تمہاری پسند ہی ہماری پسند ہے کیوں ندیم کی امی!''

''ہاں جی! بیٹے کی پسند ہماری پسند ہے۔'' امی نے دہراتے ہوئے کہا۔

''تو ٹھیک ہے ہم کل ان کے گھر رشتہ کے لئے جائیں گے۔ کیوں ندیم!'' ابا نے زور کا قہقہہ لگایا۔

''لیکن ابا!''

''کیوں بھئی اب کیا پرابلم ہے؟'' ابا نے پوچھا۔

''پرابلم یہ ہے کہ آسیہ کے ماموں پرانے خیالات کے ہیں۔ اگر ان کو ذرا بھی ہمارے رشتے کے بارے میں بھنک لگی تو وہ کبھی بھی شادی کی اجازت نہیں دیں گے۔'' ندیم نے کہا:

''تو کیا کرنا چاہیے؟ اب ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا؟ تم ہی بتاؤ اس حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''ابا، کل میں آسیہ سے بات کرتا ہوں کہ اس کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟''

''ٹھیک ہے بیٹا!''

اگلے دن ہر روز کی طرح ندیم اور آسیہ کی ملاقات ہوئی اور ندیم نے شادی کی ساری تفصیل بیان کردی۔ اور پوچھا تمہارا کیا خیال ہے؟

''ندیم میرے لئے تو بہت ہی خوشی کی بات ہے۔ اتنی خوشی کی بات کہ میں کہیں خوشی سے مر نہ جاؤں۔''

''مرنے کی ضرورت نہیں ہے بس گھر والوں سے بات کرو تاکہ ہم جلدی جلدی تمہارے گھر آکر تمہارا رشتہ مانگ سکیں۔ اگر تم کہو تو میں تمہارے ساتھ گھر چل کر تمہارے ماموں سے بات کرسکتا ہوں۔''

''نہیں! ندیم تم کبھی ایسا مت کرنا۔'' آسیہ نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

''تم نے وعدہ کیا تھا کہ گھر چلنے کی ضد نہیں کروگے۔''

''اچھا بھئی ٹھیک ہے تم تو بات کروگی نا؟''

''ہاں! میں بات کروں گی۔''

اگلے دن آسیہ روتے ہوئے ندیم سے ملنے آئی۔

''کیا ہوا آسیہ؟'' ندیم نے پوچھا

آسیہ نے کچھ جواب نہیں دیا۔

''آسیہ! کیا ہوا؟ تم کیوں رو رہی ہو۔ جواب کیوں نہیں دیتی؟''

''آسیہ تھوڑا سنبھل کر بولی۔ ''ندیم! ندیم۔''

''ہاں آسیہ کہو۔''

''وہی ہوا جسکا مجھے ڈر تھا۔ ماموں نے صاف انکار کر دیا۔''

''کیا!''

''ہاں ندیم' تو کیا اب ہم جدا؟''

ندیم نے فوراً آسیہ کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ کو بولنے سے روک دی۔ آئندہ ایسا کہنا مت کرنا، ندیم نے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن سنو اگر میرے ماموں تیار نہ بھی ہوئے تو میں تیار ہوں۔''

''کیا!'' ندیم نے کہا

''وہ کیسے؟''

''میں تم سے شادی کروں گی اگر تم مجھے اپنانے کو تیار ہو تو۔۔۔''

''ہاں! آسیہ میں تیار ہوں۔''

شادی کا سارا انتظام ندیم کے گھر پر رکھا گیا۔ گھر میں شادی کے شادیانے بجائے جانے لگے۔ گیت گائے جانے لگے۔ دلہا دلہن کو ہلدی لگائی گئی۔ مہندی لگائی گئی۔ اور نکاح کے بعد شادی مکمل ہوگئی۔

دلہن کو روم میں لے جا کر بیڈ پر بیٹھایا گیا۔

لڑکیاں ہنسی مذاق کرتی ہوئی روم سے باہر نکلیں اور دروازہ بند کر دیا۔

ارے ندیم بیٹا! جاؤ کمرے میں دلہن تمہارا انتظار کر رہی ہوگی؟

اچھا امی جاتا ہوں۔

ندیم شرماتے ہوئے لیکن بہت خوشی سے دلہن کے کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کئے بغیر سیدھے آسیہ کے پہلو میں لیٹ گیا۔ اور آسیہ کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ آسیہ! آسیہ

آسیہ گھونگھٹ میں شرماتی ہوئی کبھی دیکھتی اور کبھی مسکراتی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

"آخر میں نے آپ کو پا ہی لیا"۔

آسیہ اب اور دوری برداشت نہیں ہوتی۔ ندیم نے اسے بے تابی سے چھیڑا۔

ارے! میں تو لائٹ ہی آف کرنا بھول گیا۔ کہتے ہوئے ندیم نے جونہی اٹھنے کی کوشش کی آسیہ نے ہاتھ سے ندیم کو روک لیا۔ اور گھونگھٹ کی آڑ سے دھیرے دھیرے سے بولی آپ بیٹھئے میں لائٹ آف کر دیتی ہوں۔ اور بیڈ سے بیٹھے بیٹھے اپنا ہاتھ لمبا کیا اور لائٹ آف کر دی۔



سرجو

فقیروں کو پیسے دیتے ہوئے کلیم صاحب مسجد کی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔کہ اچانک ایک فقیر کو دیکھتے ہی رک گئے......جس نے ایک گندے پھٹے ہوئے کمبل میں منہ کو چھپاتے ہوئے کہا......ارے بابا اللہ کے نام پر کچھ دے دو...... اللہ تمہارا بھلا کرے گا......کلیم صاحب کو اس کی آواز کچھ جانی پہچانی سی لگی......انھوں نے فقیر سے پوچھا:

تم کون ہو؟ فقیر نے کمبل کی آڑ سے دیکھتے ہوئے کہا مجھ سے دور

رہو۔لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں...... مجھے دھتکارتے ہیں۔

کلیم صاحب نے اسے ایک روپیہ دیا اور آگے بڑھ گئے۔ کچھ دوری پر کلیم صاحب کے دوست اشفاق یہ سب دیکھ رہے تھے۔جونہی کلیم صاحب اشفاق کے پاس پہنچے، اشفاق نے کہا، ارے بھئی تم وہاں کہاں رک گئے تھے۔اور اس فقیر سے کیا بات کر رہے تھے؟

کلیم صاحب مسجد کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے کہا،"بس یونہی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس پر نظر پڑی۔لیکن میں اس آدمی کو جانتا ہوں۔"

کلیم صاحب کی بات سن کر اشفاق حیرت سے انھیں دیکھتے ہوئے بولے۔"وہ کیسے؟"

کلیم صاحب نے اشفاق کو دیکھا اور کہا یہ سرجو ہے'سرجو اور کہانی شروع ہوگئی۔

بات ان دنوں کی ہے جب کلیم صاحب کپڑے کا تجارت کرتے تھے اور پیسے والے ہونے کے باوجود بھی کلیم صاحب کافی ایماندار، سخی اور نیک انسان تھے۔لوگوں کا دکھ ان سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔اور جہاں کہیں بھی موقع ملتا لوگوں کی مدد کرنے سے نہیں چوکتے تھے...... سوسائٹی میں ان کی اچھی ساکھ تھی۔لوگ ان کی دل سے عزت کرتے تھے اور ان کی ایمانداری کی مثال بھی دیتے تھے۔

ایک دن ایک مسافر ان کی دکان کے پاس آ کر ٹھہر گیا۔ کلیم صاحب نے دیکھا تو کپڑے کافی میلے اور گندے تھے، اور دیکھنے سے وہ آدمی کافی تھکا ہوا اور بھوکا بھی لگ رہا تھا...... دھوپ اور گرمی کی وجہ سے اس شخص کی حالت بہت خراب تھی۔ کلیم صاحب اپنی دکان سے باہر نکلے اور اس شخص کو دکان کے اندر لے کر بیٹھاتے ہوئے اسے ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا گلاس دیا...... مسافر جب پانی پیتے ہی تر و تازہ ہو گیا تو کلیم صاحب نے اس سے پوچھا...... بھئی! تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ مسافر نے جواب دیا میں سونا پور گاؤں سے آیا ہوں۔ گاؤں میں آ کال پڑ گیا تھا۔ میرے گھر کے سبھی لوگ آ کال اور بھوک کی وجہ سے مر گئے۔ اسلئے مجھے گاؤں چھوڑ کر شہر کی طرف آنا پڑا۔ پھر کلیم صاحب کی طرف دیکھا اور کہا صاحب اگر مجھے کوئی کام کاج مل جائے تو......

"ہاں! ہاں! کیوں نہیں۔" کلیم صاحب نے جواب دیا۔ "لو پہلے یہ کھانا کھالو۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" کلیم صاحب نے پوچھا

مسافر نے پلیٹ کو کلیم صاحب کے ہاتھ سے جھپٹ کر جلدی جلدی کھانا کھانا شروع کیا۔ اسکے کھانے کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کافی دنوں سے بھوکا ہے۔

کلیم صاحب نے مسافر سے پھر پوچھا؟ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

مسافر نے جواب دیا۔ ”جی سرجو!“

کھانے کے بعد کلیم صاحب سرجو کو گھر لے گئے۔ گھر کیا تھا کسی حویلی سے کم نہیں تھا۔

”آؤ سرجو! اندر آؤ۔“

جونہی کلیم صاحب کی آنے کی آہٹ ہوئی تو اندر سے ان کی بیوی اور پانچ سال کا بیٹا باہر آئے۔ بیٹا ابا کو دیکھ کر دوڑ کر ان کی گود میں بیٹھ گیا اور دھیرے سے پوچھنے لگا، ابا یہ بھیا کون ہیں؟ کلیم صاحب نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ تم کہتے تھے نا کہ میں کس کے ساتھ کھیلوں؟ میں تمہارے لئے اس بھیا کو لایا ہوں، کہتے ہوئے کلیم صاحب نے چھوٹے ابراہیم کا منہ چوم لیا۔

آؤ سرجو! اندر آؤ۔ دیکھو بھئی اب تم اس گھر کو اپنا گھر سمجھو! اور ابراہیم کی امی کا کچن میں ہاتھ بٹا دیا کرو۔ سرجو نے آنکھوں سے آنسو ٹپکاتے ہوئے کہا صاب آپ نے مجھ پر بہت احسان کیا۔

احسان کی کوئی بات نہیں ہے۔ بس تم دل لگا کر کام کرنا۔

سرجو نے بھی کچھ ہی دنوں میں گھر کو بھی اپنا بنا لیا اور گھر والوں کے دلوں میں گھر کر گیا۔ دن بھر گھر کا کام کرتا، ابراہیم کے ساتھ کھیلنا اور رات میں اسے اچھی اچھی کہانیاں بھی سنانا۔ ابراہیم بھی سرجو سے اچھا گھل مل گیا تھا۔

ابراہیم بیٹا کھانا کھالو، ابراہیم کی امی ساجدہ نے ابراہیم کو آواز لگاتے ہوئے کہا۔

نہیں امی میں سرجو بھیا کے ہاتھ سے کھانا کھاؤں گا۔ابراہیم نے نخرے کرتے ہوئے کہا۔

سرجو! بھئی تم ہی اسکو کھانا کھلا کر سلا بھی دینا۔

جی! بیگم صاحبہ،سرجو نے ابراہیم کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

سرجو کو گھر کے کام کاج سے فارغ ہوتا تو وہ کلیم صاحب کے ساتھ دکان کے حساب کتاب میں ان کا ہاتھ بٹا دیتا۔

کلیم صاحب اور گھر والے سرجو سے بہت خوش تھے۔ کیوں نہ ہوتے،سرجو کلیم صاحب کی طرح ایماندار اور محنتی جو تھا۔اور اپنی محبت سے سب کے دلوں کو جیت بھی لیا تھا۔اور کلیم صاحب نے بھی اسے گھر کا ایک فرد بنالیا تھا۔

ایک دن کلیم صاحب نے سرجو سے کہا، بیٹا سرجو مجھے تجارت کے کام سے دلی جانا ہے آنے میں مجھے دو تین مہینے لگ جائیں گے۔ اسلئے میری غیر حاضری میں گھراور دوکان تمہارے ذمے ہیں۔

سرجو نے سر جھکاتے ہوئے کہا، جی صاب میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ میں جی جان سے آپ کے نمک کا قرض ادا کروں گا۔ اور اپنا

فرض بھی نبھاؤں گا۔

کلیم صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا مجھے تم سے یہی امید تھی کہتے ہوئے دلی کے لئے روانہ ہو گئے۔

سرجو کام میں بہت مصروف رہنے لگا۔ ایک دن اس نے ساجدہ بیگم سے کہا مجھے گاؤں جانا ہے۔ گھر سے چٹھی آئی ہے۔ اماں بیمار ہیں۔ بس میں دو ایک دن میں ان سے مل کر واپس آ جاؤں گا۔ یہ کہہ کر سرجو گھر سے نکل گیا۔

دن گزرتے گئے۔ لیکن سرجو واپس نہیں آیا اور کلیم صاحب دلی سے واپس بھی آ گئے۔ انھوں نے سرجو کی کھوج خبر لی لیکن سرجو کا کوئی اتا پتا نہیں چلا۔ دکان کا بھی سارا مال غائب تھا۔ لوگوں سے بھی سرجو نے کلیم صاحب کے نام پر ادھار لیا تھا اور پڑوس کی لڑکی کو بن بہائی ماں بنا کر سب کو دھوکا دے کر رفو چکر ہو گیا تھا۔

آج سرجو کو مسجد کی سیڑھیوں پر بھیک مانگتے دیکھ کلیم صاحب کے منہ سے ساختہ نکل گیا:

”خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی......وہ دنیا میں بھی سزا دیتا ہے، تاکہ لوگ عبرت حاصل کر سکیں۔“



چھوٹی سی محبّت

ابا کے انتقال کے بعد رشتہ داروں نے ساری جائداد پر قبضہ تو کرلیا لیکن اگر امی مجھے وہاں سے لیکر بھاگ نہیں آتیں تو خاندان والے ہماری بوٹیاں گدھ اور چیل کی طرح نوچ کھاتے۔

امی بڑے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں مگر ابا سے گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کرنے کی وجہ سے ان لوگوں نے امی سے ہمیشہ کے لئے تعلق توڑ ڈالا تھا' اس لیے ہمیں کشمیر میں پناہ لینی پڑی۔ اُس وقت میری عمر

تقریباً گیارہ برس تھی۔ کشمیر میں ابا کے دوست رہتے تھے، سو انھوں نے ہمارے رہنے کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ امی پڑھی لکھی تھیں لہٰذا انھیں کسی اسکول میں ٹیچر کی ملازمت مل گئی اور پھر امی نے مجھے بھی اسکول میں داخل کروا دیا۔

ہم جس گھر میں رہتے تھے وہ ایک بہت بڑا گھر تھا۔ چھوٹے چھوٹے کمرے تھے اور ہر کمرے میں کرایہ دار رہتے تھے۔ ہمارے سامنے والے کمرے میں ایک کرایہ دار رہتا تھا جس کی عمر ستائیس سال رہی ہوگی۔ چہرے پر داڑھی تھی۔ رنگ گورا اور قد درمیانہ تھا۔ وہ کرتا پائجامہ پہنتا تھا جو تقریباً ٹخنوں سے اوپر ہوتا تھا اور ہاں سر پر سفید رنگ کی ٹوپی بھی ہوتی تھی۔ دیکھنے میں تو خوبصورت تھا لیکن مزاج کچھ عجیب سا تھا۔ اس کے کمرے کا راستہ ہمارے کمرے کے سامنے سے ہو کر گزرتا تھا۔ وہ کسی کالج میں پڑھتا تھا اور ہوسٹل میں نہ رہ کر کمرہ کرایے پر لے کر رہتا تھا۔ وہ ایک اچھے گھرانے سے تھا لیکن اس کا حلیہ اور رہن سہن اتنا سادہ تھا کہ کہیں کسی طرح سے بھی وہ پیسے والے گھرانے کا نہیں لگتا تھا۔ میں اکثر کھیلتے ہوئے اسے اپنے کمرے کے سامنے سے گزرتے دیکھتی تھی۔ مگر وہ تھا کہ کسی کو بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا بس یا تو وہ اپنی پڑھائی میں لگا رہتا یا پھر پابندی سے نماز پڑھنے مسجد جاتا تھا۔

ہمارے کمرے کے سامنے سے اکثر گزرنے کی وجہ سے اس کا سامنا مجھ سے ہوتا تو کبھی کبھار نیچی نظروں سے سلام کر لیتا اور آگے بڑھ جاتا۔ ویسے ہماری اس سے زیادہ جان پہچان نہیں تھی۔ ارے میں تو اس کا نام بتانا ہی بھول گئی...... اسکا نام محسن تھا۔ محسن امی سے تو سلام کرتا لیکن مجھ سے کبھی بات کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

کبھی کبھار محسن ہمارے گھر آتا اور امی کے پاس بیٹھتا۔ امی جب اس سے کوئی سوال پوچھتی تو وہ جواب ضرور دیتا۔ شاید اچھا جواب دیتا لیکن اس کے جواب دینے کا جو طریقہ تھا وہ بہت سخت ہوتا تھا۔ یعنی جتنا سوال اتنا ہی جواب۔ اپنی طرف سے کبھی بھی نہ تو کوئی سوال ہی کرتا اور نہ ہی بات شروع کرتا۔ اس کی یہ عادت مجھے بہت عجیب لگتی تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ وہ اچھا انسان نہیں تھا۔ وہ اچھا انسان تو تھا ہی ساتھ ساتھ وہ بہت نیک بھی تھا۔ لیکن کافی ریزرو ٹائپ ہونے کی وجہ سے لوگوں سے مختلف لہجے میں بات کرتا تھا۔

امی جب کبھی کوئی اچھی چیز میرے لئے بناتیں تو کہتیں جا تھوڑا محسن کو بھی دے آ۔ محسن برتن لے لیتا اور سامان لیکر خالی برتن بغیر کچھ کہے مجھے واپس کر دیتا۔ میں من ہی من میں سوچتی کہ کم از کم شکریہ تو ادا کر ہی سکتا تھا۔

ایک دن میں اسکول سے واپس آئی تو دیکھا امی بستر پر لیٹی ہیں اور محسن ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا ہے۔ امی نے مجھے دیکھا تو کھانستے ہوئے بولیں بیٹا وہاں کھانا رکھا ہے کھا لو۔ آج میری طبیعت کچھ خراب ہے۔ میں کھانا وانا چھوڑ کر امی کے پاس دوڑ کر گئی اور ان سے لپٹ گئی۔ امی نے بھی مجھے سینے سے لگاتے ہوئے محسن سے بولیں۔ مجھے صرف اپنی بچی کی فکر ہے نہ جانے میرے بعد اسکا کیا ہوگا؟ دنیا میں اسکا میرے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ پھر محسن کی طرف دیکھا اور کہا کیا تم میرے جانے کے بعد اسکا خیال رکھو گے۔ میں تمہارے سوا دنیا میں کسی اور پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔ محسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔

امی کی طبیعت میں سدھار کے بجائے دن بہ دن اور زیادہ خراب ہونے لگی اور ایک دن امی مجھے محسن کے حوالے کر۔ کے اس بھری دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں۔

محسن کا پوسٹ گریجویشن ختم ہو چکا تھا اور وہ آگے کی پڑھائی کے لئے باہر ملک جانا چاہتا تھا لیکن میری وجہ سے پریشان تھا کہ اب مجھے کہاں لے جائے اور اس کے گھر والے بھی میرے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ پھر محسن نے مجھے بورڈنگ میں داخل کرایا اور خود امریکہ چلا گیا۔ ایسا نہیں تھا کہ مجھے بورڈنگ میں داخل کرانے کے بعد اس نے

میری خبر نہیں لی بلکہ وہ برابر میرا خرچہ بھی بھیجتا تھا اور جب کبھی امریکہ سے واپس آتا تو مجھ سے ملنے ضرور آتا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ میں بھی اب جوان ہو چکی تھی۔ میری سہیلیاں کہتی تھیں کہ میں اپنی امی کی طرح خوبصورت ہوں۔ نہ جانے کب، کیسے میرے دل میں محسن کے لئے سوفٹ کورنر ہوگیا مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ میں ہمیشہ محسن کے فون کا بے صبری سے انتظار کرتی۔ یا بہانہ ڈھونڈتی رہتی محسن سے بات کرنے کا۔ اور اسکے خوابوں خیالوں میں کھوئی رہتی۔ اور اپنے آپ سے سوال کرتی، کیا یہی پیار تو نہیں؟ اور یہ تو صرف ایک طرفہ پیار تھا۔ وہ بھی مجھ میں ان کے سامنے اپنے پیار کا اظہار کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ لیکن شکر ہے محسن نے مجھ سے بات کرنا شروع تو کیا لیکن اتنی ہی بات جتنی ضروری ہو اور جتنے کی ضرورت ہو۔ اگر محسن کبھی مجھے میرے نام سے پکارتے تو میرے من میں لڈو پھوٹنے لگتے اور اپنا نام مجھے بہت خوبصورت معلوم ہوتا۔

میری گریجویشن مکمل ہو چکی تھی اور محسن کی امریکہ میں چھٹیاں بھی چل رہی تھیں۔ محسن انڈیا آئے تو وہ ہمیشہ کی طرح مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔

محسن نے سر نیچے کئے ہوئے مجھ سے پوچھا، کیسی ہو؟ گریجویشن میں کیا پرسنٹیج رہی۔

''اچھی ہے''۔ میں نے جواب دیا

محسن کچھ اور پوچھتے اس سے پہلے میں نے محسن کے سامنے ایک ڈیمانڈ رکھ دی۔

''میں چھٹیوں میں آپ کے ساتھ گھر چلنا چاہتی ہوں۔''

محسن نے دھیرے سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر بے رخی کے انداز میں جواب دیا۔ٹھیک ہے کل صبح تیار رہنا، میں تمہیں لینے آؤں گا۔

یہ سن کر میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔خوشی کے مارے رات بھر نیند نہیں آئی، انتظار کرتی رہی کہ کب صبح ہو؟ جیسے تیسے صبح ہوئی اور محسن مجھے لینے آ گئے۔

''تمہارا سامان کہاں ہے؟''

''لاؤ گاڑی میں رکھو!''

گاڑی میں سامان رکھنے کے بعد میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

آگے کی سیٹ پر بیٹھو! میں کوئی تمہارا ڈرائیور نہیں ہوں۔

روکھے انداز میں محسن نے کہا۔ میں اپنی سیٹ سے دھیرے سے اٹھی اور آگے والی سیٹ پر محسن کے ساتھ بیٹھ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہم دونوں ساتھ ساتھ گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے

میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا۔ میں آنکھیں بند کئے من ہی من میں خواب دیکھ رہی تھی شاید اسی کو کھلی آنکھ سے خواب دیکھنا کہتے ہونگے بہرحال کچھ بھی ہو خواب بہت حسین تھا۔ اور دعا کر رہی تھی کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔ یونہی زندگی بھر چلتا رہے۔

گاڑی رکی اور محسن نے کہا گھر آ گیا۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو واقعی گھر آ چکا تھا لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم اتنی جلدی کیسے پہنچ گئے۔

محسن گاڑی سے اترے اور مجھے کچھ کہے بغیر گھر کے اندر چلے گئے۔ اندر سے ان کا نوکر گلشن آیا اور اس نے سامان کو اٹھایا اور کہا صاب آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔ میں دوڑتی بھاگتی تیزی سے گھر کے اندر داخل ہوئی تو دیکھا محسن فون پر بات کر رہے ہیں۔ میں وہیں کھڑی رہی اس انتظار میں کہ وہ فون پر بات ختم کر کے کچھ کہیں گے۔ انھوں نے تھوڑی دیر کے بعد ریسیور کو فون پر رکھتے ہوئے کہا' اوپر تمہارا کمرا ہے جاؤ آرام کرو۔ اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو نوکر سے کہنا اور یہ کہہ کر آفس چلے گئے۔ میں کافی تھکی تھی اسلئے مجھے نیند آ گئی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ کون ہے؟ اس امید میں تھی کہ شاید محسن ہونگے! اور تکیہ کو اپنے گود میں لیتے ہوئے کہا اندر آئیے! نوکر اندر داخل ہوا۔ میم صاب کھانا ٹیبل پر لگا دیا ہے۔ چلئے کھا لیجئے ٹھنڈا ہو جائے گا۔ دن بھر سے آپ نے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ اچھا! ٹھیک

ہے مگر صاحب نے کھانا کھایا؟ کہاں کھایا۔ صاب تو صبح جلدی آفس کے لئے نکل جاتے ہیں اور دیر رات واپس آتے ہیں۔ نوکر نے کہا:

دوسرے دن محسن کے جانے کے بعد میں نے ان کا کمرا صاف کیا، کپڑوں کو سلیقے سے الماری میں رکھا، ان کی چپل کو بیڈ کے پاس رکھا، پانی رکھا اور ضرورت کا ہر سامان کو سلیقے سے ڈریسنگ ٹیبل پر سجا کر رکھ دیا، اور ہاں ان کا ٹاول جو کبھی ان کو نہیں مل پاتا تھا وہ بھی واش روم میں رکھ دیا اور جلدی جلدی کچن میں جا کر ان کی پسند کا کھانا بنایا۔

کھانا بنانے کے بعد صوفے پر دیر رات تک ان کا انتظار کرنے لگی انتظار کرتے کرتے میری آنکھ لگ گئی کہ اچانک گاڑی کے ہورن کی آواز آئی میں جلدی سے کھڑی ہوگئی۔

محسن ہاتھ میں بریف کیس لئے اندر داخل ہوئے اور نوکر سے کہا کھانا ٹیبل پر لگا دو۔ میں ابھی فریش ہو کر آتا ہوں۔ واپس آئے اور ڈائنگ ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ آج کھانے سے تو بہت اچھی خوشبو آ رہی ہے۔ منہ میں ایک لقمہ ڈالا اور تھوڑا چباتے ہوئے نوکر سے بولے گلشن آج کیا بات ہے میرا کمرا صاف ستھرا ہے اور ہر چیز بڑے سلیقے سے بھی تم نے رکھی ہے اور ہاں! کھانا تو آج تم نے میری پسند کا بھی بنایا ہے وہ بھی اتنا ٹیسٹی، کیا تنخواہ بڑھوانی ہے؟۔ یہ کہتے ہوئے محسن مسکرا دئے۔

جی نہیں صاب ! یہ سب ہم نے نہیں کیا ہے اور نہ ہی ہم نے کھانا بنایا ہے یہ سب تو نجمہ بٹیا نے بنایا ہے۔

اچھا! کہہ کر محسن نے کھانا ختم کیا اور سیدھے اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلے گئے ۔ یہ سب میں دور سے چھپ کر دیکھ رہی تھی۔ انھوں نے میرے کھانے کی تعریف کی تو مجھے بہت اچھا لگا۔

اگلے دن محسن آفس سے جلدی گھر آ گئے۔ گلشن سے مجھے بلانے کے لئے کہا۔ میں ڈرتے ہوئے آ کر دھیرے سے ان کے پاس کھڑی ہوگئی، اور کہا آپ نے بلایا؟

ہاں! یہ کچھ کپڑے اور تھوڑا سامان تمہارے لئے لایا تھا۔ دیتے ہوئے کہا۔ شام کو تیار رہنا کچھ مہمان تم سے ملنے کے لئے آئیں گے۔

"لیکن کیوں!"

"کیوں ! محسن نے دہراتے ہوئے کہا ، اسلئے کہ سلمان اچھے گھرانے سے ہے۔ اکلوتا ہے، پڑھا لکھا ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی جاب بھی ہے۔ تم اس کے ساتھ بہت خوش رہوگی۔" محسن نے کہا۔

"لیکن میں سلمان سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"کیوں؟ کیا کمی ہے اس میں؟"

"کیا تمہاری کوئی اور پسند ہے؟" محسن نے ذرا سختی سے پوچھا

میں خاموش رہی۔

''جواب کیوں نہیں دیتی۔''

''ہاں میری پسند ہے۔''

''کون؟''

''میں پھر خاموش رہی۔''

''تم بولتی کیوں نہیں؟'' بار بار اصرار کرنے پر میں نے جواب دیا۔

''آپ!'' یہ کہتے ہوئے پہلی بار محسن نے میری طرف گھور کر دیکھا، کمرے میں چاروں طرف خاموشی چھا گئی' ایسا لگ رہا تھا کہ وقت رک سا گیا ہے۔

''تم کیا بول رہی ہو؟ ہوش میں تو ہو؟''

''ہاں ہوش میں ہوں!'' میں نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔

آپ نے میری پسند جاننا چاہی اور میں نے اپنی پسند بتا دی۔ یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے' گلا بھر آیا۔

''یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔'' محسن نے کہا

''کیوں؟ کیا وجہ ہے؟ مجھ سے شادی نہ کرنے کی۔''

اور اب کی بار صبر کا باندھ تقریباً ٹوٹ گیا۔ میں زور زور سے رونے لگی۔

''تم جانتی ہو یہ نہیں ہوسکتا؟''

''نہیں میں نہیں جانتی۔ اسی لیے تو پوچھ رہی ہوں۔ آخر کیا کمی

ہے مجھ میں!"

"میں تم سے اٹھارہ سال بڑا ہوں۔"

تو کیا صرف ایک یہی وجہ ہے انکار کی۔لیکن میں آپ سے ہی شادی کرنا چاہتی ہوں ۔میں ! میں ! ہکلاتے ہوئے بولی کہ میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ آپ کے بغیر جی نہیں سکتی۔ اور کہتے ہوئے محسن کے گلے لگ کر زور زور سے رونے لگی۔ مجھے اپنے سے الگ مت کیجئے۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔

ہارن بجاتی ہوئی گاڑی گھر کی پارکنگ میں آ کر رکی اور کار سے دو چھوٹے بچے اترے اور مما! مما! کہتے ہوئے گھر کے اندر دوڑتے چلے گئے۔مما! مما دیکھو پاپا نے ہمیں کتنی ساری چیزیں خرید کر دیں۔بچوں نے ہنگامہ کرتے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے،ٹھیک ہے۔لیکن تمہارے پاپا ہیں کہاں؟ آشا نے بچوں سے پوچھا؟

ہم آپ کو چھوڑ کر آخر کہاں جاسکتے ہیں؟ یہ کہتے ہوئے محسن آشا کے پاس آ گیا اور آشا کو گلے سے لگاتے ہوئے پیار سے بولا میری پیاری پگلی!



شادی کا تحفہ

کل شادی ہے اور ابھی بھی اسکی شاپنگ ختم نہیں ہوئی۔ امی نے شادی کا سامان سمیٹتے ہوئے کہا۔ امی میں شہلا کو شاپنگ کے لئے لے جاتا ہوں۔ ماجد نے شہلا کو آواز لگائی۔

آتی ہوں بھیا۔ شہلا نے سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔

امی کو ناراض دیکھ کر شہلا نے امی کو پیار سے بھینچ لیا اور لاڈ کرتے ہوئے منوانے لگی کہ میری پیاری، ذرا مسکراؤ نا۔ امی بھی مسکرا کر بول پڑی

کہ اچھا اب چھوڑ مجھے، بہت کام پڑا ہے۔

امی میں جاؤں؟

ہاں جاؤ اور دیکھو جلدی آنا، او کے امی! کہتے ہوئے شہلا ماجد بھائی کے ساتھ مارکیٹ کے لئے نکل گئی۔

شاپنگ سے واپسی میں ریڈ لائٹ پر کار رکی تو شہلا نے جلدی سے گاڑی سے نکلتے ہوئے ماجد بھائی سے کہا، میں ابھی آتی ہوں۔

ارے کہاں جا رہی ہو؟ ماجد نے گاڑی کو ایک طرف پارک کرتے ہوئے کہا۔

ماجد نے دیکھا کہ شہلا ایک لڑکی سے بات کر رہی ہے۔ دیکھنے میں ناک نقشہ تو اچھا ہی تھا لیکن کپڑوں کی حالت دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ کافی غریب ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد شہلا واپس آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

یہ لڑکی کون تھی؟ اس سے ملنے کے بعد تم کافی پریشان لگ رہی ہو۔ کیا بات ہے؟

ماجد نے ایک ہی سانس میں بول پڑا۔

ماجد بھائی یہ میری بیسٹ فرینڈ ہوا کرتی تھی۔

ماجد نے تعجب سے کہا! یہ! تمہاری بیسٹ فرینڈ تھی۔

ہاں شہلا نے جواب دیا۔ ہم دونوں کالج میں ساتھ پڑھتے تھے۔

پڑھائی لکھائی، کھیل کود، ڈرامہ وغیرہ میں ہمیشہ اول آتی تھی۔ دیکھنے میں بھی بلا کی خوبصورت تھی۔ اگر اس میں کسی چیز کی کمی تھی تو وہ تھی کہ وہ زیادہ پیسے والے گھر کی نہیں تھی۔ اس کے ابا کسی سرکاری آفس میں ملازم تھے۔ لیکن اپنی بیٹی پر ہمیشہ فخر کرتے تھے۔ مریم اپنے ماں باپ کی آن بان اور شان تھی۔ ہمارا کالج کا آخری سال تھا۔ ایک دن کلاس کے دوران پرنسپل صاحب کا چپراسی کلاس میں داخل ہوا۔

مریم کون ہے؟

مریم گھبرائی ہوئی بولی۔ م......م......میں

پرنسپل صاب نے آپ کو آفس میں بلایا ہے۔

لیکن کیوں؟

مجھے نہیں معلوم۔

مریم نے آفس کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے آواز آئی کم اِن۔

پرنسپل صاحب بغیر دیر کئے ٹیبل کی ڈراز سے فوٹو نکال کر ٹیبل پر غصہ میں پٹکتے ہوئے بولے کہ یہ تم ہی ہو نا؟

مریم نے فوٹو ہاتھ میں لیا اور تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ بول پاتی، پرنسپل صاحب نے غصہ میں کہا،

ایسی اشلیل فوٹو! تم ایک برلینٹ اسٹوڈنٹ ہو۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ جانتی ہو ! تمہاری اس حرکت سے کالج بدنام ہو سکتا ہے۔ مریم کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسوں بارش کی طرح بہنے لگے۔ پرنسپل صاحب نے کہا میں تمہیں اس حرکت کے لئے رسٹی کیٹ کر سکتا ہوں۔

مریم پرنسپل صاحب کے پیروں میں گرگئی اور روتے ہوئے کہا سر! میں قسم کھا کر کہتی ہوں مجھے نہیں معلوم اس فوٹو گراف کے بارے میں۔

دھیرے دھیرے یہ خبر پورے کالج میں جنگل کے آگ کی طرح پھیل گئی۔ مریم جہاں سے بھی گذرتی ہزاروں آنکھیں اس کو گھورتیں۔ سب لوگ اسکو دیکھکر ٹھہا کا لگاتے، سیٹی بجاتے، فقرے کستے۔ کالج سے دھیرے دھیرے یہ خبر مریم کے محلے تک پہنچ گئی۔ لوگ مریم کے باپ سے کہتے پھرتے:

"ارے صاحب لڑکی کو اتنی آزادی نہیں دینی چاہے تھی۔ دیکھا لڑکی کو پڑھانے کا نتیجہ!"

مریم کے ابا لوگوں سے منہ چھپا کر چلنے لگے۔ کبھی کوئی راستے میں جاننے والا ٹکراتا تو مریم کے بارے میں پوچھ کر افسوس ظاہر کرتا۔

گھر آنے کے بعد نسیم کرسی پر مایوسی سے بیٹھ گئے اور مریم سے کہا مریم آج تمہاری وجہ سے میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ آج

وہ لوگ جو کبھی میرے سامنے کھڑے ہونے سے گھبراتے تھے صرف تمہاری وجہ سے مجھ پر ہنس کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ آج مجھے سمجھ میں آیا کہ لوگ بیٹی پیدا ہونے پر افسوس کیوں کرتے ہیں؟

ابا کیا آپ بھی مجھے قصوروار سمجھتے ہیں؟ اگر آپ کی نظروں میں، میں قصوروار ہوں تو آپ مجھے اپنے ہاتھوں سے گلا دبا کر مار دیں۔ لیکن ابا خدا گواہ ہے میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اگر مجھ پر آپ یقین نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنی پرورش پر تو یقین کیجئے۔

"میں تو یقین کرلوں گا، لیکن لوگوں کو کون سمجھائے کہ تو بے قصور ہے، کون بھلا انسان تیرا ہاتھ تھامے گا۔۔۔ بتا؟" نسیم آبدیدہ نگاہوں سے بول پڑا

"اب صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے۔۔۔ شادی۔"

کل منیر صاحب تیرے لئے بیگ صاحب کے بڑے بیٹے جبار کا رشتہ لائے تھے۔ میں جانتا ہوں وہ تین بچوں کا باپ ہے اور عمر بھی زیادہ ہے لیکن اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ دیکھ تو انکار مت کرنا۔ اب ہماری عزت تیرے ہاتھوں میں ہے۔

مریم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ابا جیسا آپ ٹھیک سمجھیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

مریم بیٹی مجھے غلط نہیں سمجھنا۔ میں جانتا ہوں کہ تو بے قصور ہے۔ میں نے جو ٹھیک سمجھا وہ کیا، میری بچی! لیکن میری ایک بات اپنے پلے باندھ لے۔ باپ کے گھر سے لڑکی کی ڈولی نکلتی ہے لیکن شوہر کے گھر سے بیوی کا جنازہ ہی نکلنا چاہیے۔ میری پیاری بیٹی! اب وہی تیرا گھر ہے۔ جی کر یا مر کر، تجھے وہیں رہنا ہوگا۔ ہم لوگ اب تیرے لئے پرائے ہو چکے ہیں۔ واپس مت آنا۔

اور یوں چند دنوں کے اندر مریم بیگ صاحب کے بیٹے سے شادی کے بندھن میں بندھ گئی۔ شادی کے کچھ دن تو ٹھیک سے گذرے لیکن پھر کسی نہ کسی بہانے مریم کو شوہر سے بات بات پر تانے سننے پڑتے۔ چھنال! میرے ہی گلے پڑنا تھا تجھے! پتا نہیں کتنوں سے منہ کالا کیا ہوگا۔ ایک دن ماریہ کو یہ کہتے ہوئے گھر سے نکال ہی دیا گیا کہ نکل جا میرے گھر سے، تجھ جیسی بدچلن کے لئے میرے گھر میں اب جگہ نہیں ہے۔ میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔ مریم کے گھر والوں نے تو اسے پہلے ہی بیگانہ کر دیا تھا۔ اور رشتہ داروں نے بھی منہ پھیر لیا۔

شہلا کی زبان تھوڑی دیر کے لئے رکی اور پھر آہ بھرتے ہوئے بول پڑی کہ آج اتنے برسوں بعد جب میں نے اسے دیکھا تو پہچان نہیں سکی۔ کالج کے زمانے میں کتنی چنچل اور شوخ ہوا کرتی تھی اور اب دیکھو!

ایسا لگتا ہے مانو بے جان پتھر کی مورت بن گئی ہو۔

ماجد نے پوچھا، کیا ان تصویروں میں کچھ حقیقت تھی؟

''نہیں''، شہلا سر ہلا کر بولی۔''دراصل ہمارے کلاس کے کچھ لڑکے آئے دن مریم سے دل لگی کی باتیں کرتے اور پرپوز کرتے لیکن جب مریم نے انھیں صاف انکار کر دیا تو ان شرارتی لڑکوں نے مریم کے خلاف چال چلی۔''

''کیا چال؟''

''چال یہ چلی کہ ان لڑکوں میں سے ایک لڑکا جو اکثر مریم کو چھیڑتا تھا معافی مانگنے کے بہانے اپنے گھر بلایا اور اس کو بدنام کر دیا۔ شہلا نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ لیکن میں جانتی ہوں مریم ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ وہ بے قصور اور معصوم ہے۔ ماجد بھائی مریم کو اس چیز کی سزا ملی جو اس نے خطا کی ہی نہیں۔'' یہ کہہ کر شہلا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یہ سب سن کر ماجد کچھ دیر سوچ کر پوچھ بیٹھا کہ اب مریم کہاں رہتی ہے؟

''وہ تو مجھے بھی پتہ نہیں۔'' شہلا نے کہا''لیکن سنا ہے وہ یہیں پر کسی بینک میں کام کرتی ہے۔''

اچھا اب رونا دھونا بند کرو۔ کل تمہاری شادی ہے۔ تمہاری نئی زندگی کا آغاز۔ اور نئی زندگی کا ویلکم خوشیوں سے کرتے ہیں نہ کہ آنسوؤں سے۔

دونوں بھائی بہن جب گھر پہنچے۔ مہمان بھی آ چکے تھے۔ ارے

دلہن آ گئی، چلو بھئی مہندی اور ہلدی کی رسم نبھائیں اور گھر میں مہمانوں کا آنا جانا، ہنسی مذاق کے ٹھہاکے گونجنے لگے، لیکن شہلا کا من اداس تھا۔ وہ ابھی بھی اپنی پیاری سہیلی مریم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

اگلے دن بارات آئی ۔ رسم و رواج کے ساتھ سارے کام انجام دئے گئے اور نکاح پڑھا گیا۔

مبارک! شادی مکمل ہوئی۔

دلہن کی رخصتی کا وقت بھی آن پہنچا لیکن ماجد بھائی کا کچھ پتا نہیں تھا۔

امی! ماجد بھائی کہاں ہیں؟

تبھی شہلا کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ شہلا نے دوڑتے ہوئے دروازہ کھولا۔ تو سامنے ماجد بھائی مسکرا رہے تھے ۔ شہلا روٹھنے والے انداز میں کہنے لگی۔ جایئے میں آپ سے بات نہیں کرتی۔

ارے پگلی! میں تیرے لئے شادی کا تحفہ لینے گیا تھا۔ کیا میں اپنی گڈیا کو بغیر تحفہ کے ہی بدا کر دیتا اور مریم کو ہاتھ کے اشارے سے اندر بلاتے ہوئے کہا:

”شہلا۔۔۔ تیری شادی کا تحفہ ہے تیری بھابھی۔“



پچھتاوے کا بھنور

رخسانہ دیکھو میرا اپوائنٹ منٹ لیٹر آ گیا، نے لیٹر رخسانہ کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا۔ خدا کا شکرادا کرتے ہوئے رخسانہ نے لیٹر کو چوما اور آنکھوں سے لگا لیا۔ آخر اللہ نے میری سن لی۔ سنو! ہم آج ہی بابا پیر صاحب کی زیارت پر چلیں گے اور چادر چڑھائیں گے۔ ٹھیک ہے؟ نعیم نے کہا۔

رخسانہ تم میرے لئے کتنی خوش قسمت ہو۔ جس دن سے تم میری

زندگی میں آئی ہو مجھے ہر چیز میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ تم نے مجھے اتنے پیارے پیارے بچے دیئے، کہتے ہوئے نعیم نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے منے کو گود میں اٹھالیا۔ منا اور راجو ...... ابا، ابا کہتے ہوئے ابا کے کاندھوں پر چڑھ گئے۔ نعیم بچوں کی ان پیاری حرکتوں پر مسکرا دیئے۔

میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں...... رخسانہ کچن میں چلی گئی تو نعیم بھی کچن میں یہ کہتے ہوئے چلے گئے...... چلو میں بھی چائے بنانے میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔

دراصل نعیم رخسانہ سے بہت محبت کرتے تھے...... اور رخسانہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گذارنے کے بہانے ڈھونڈھا کرتے تھے ...... آپ کو کب جوائن کرنا ہے؟ چائے کپ میں ڈالتے ہوئے رخسانہ نے نعیم سے پوچھا۔

"مجھے کل ہی الہ آباد جانا ہے پوسٹنگ وہیں ہے"۔

کیا؟ رخسانہ نے نعیم کو حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"ارے پگلی! میں جوائن کرنے کے بعد کوئی گھر دیکھ لوں گا اور تم کو اور بچوں کو وہیں بلا لوں گا۔ بس کچھ ہی دنوں کی بات ہے"۔

ٹھیک ہے۔ رخسانہ نے کہا۔

چائے پینے کے بعد رخسانہ نے پیکنگ کی اور نعیم نے الہ آباد

جانے کی تیاری شروع کر دی۔

سامان پیک ہو گیا ہے اور دیکھو اس میں کچھ لڈو، مٹھائیاں اور آپ کی پسند کی نمکین بھی ہے...... آپ کی ضرورت کا ہر سامان پیک کر دیا ہے...... آپ اپنا پورا خیال رکھیں گے...... وقت پر کھانا کھائیں گے...... اور برابر خط لکھتے رہیں گے۔ رخسانہ نے آنسوؤں کو دپٹے سے پونچھا اور نعیم کے گلے لگ کر الوداع کیا۔

نعیم نے بچوں کو پیار کیا تو بچے توتلی زبان میں پوچھنے لگے۔ ...... ابا آپ کہاں جا رہے ہو؟ آپ کب آؤ گے؟ منا نے کہا ابا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی...... راجو تینوں بچوں میں تھوڑا بڑا تھا تو ابا نے راجو سے کہا بیٹا راجو تم تو میرے سب سے بہادر بچے ہو نا...... تم امی اور اپنے بہن بھائی کا خیال رکھنا...... ابا میں خیال رکھوں گا...... کہتے ہوئے راجو ابا کے گلے لگ گیا۔ تو نعیم کا دل بھی بھر آیا۔

نعیم بھاری قدموں سے گھر کی چوکھٹ پار کر سفر کے لئے نکل گئے۔

الہ آباد پہنچ کر انھوں نے اسکول جوائن کیا اور رخسانہ کو برابر خط لکھتے رہے...... ادھر رخسانہ بھی ان کے خط کا انتظار کرتی تھی۔ ایک دن نعیم رخسانہ کو خط لکھ رہے تھے تو ان کی کلیگ مس ماریا ان کے پاس آئی اور ساتھ والی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ مس ماریہ کافی خوبصورت اور ہنس مکھ لڑکی تھی۔ اور پر

سے موڈرن خیالات کی بھی تھی۔

آپ کس کو خط لکھ رہے ہیں؟ ماریہ نے پوچھا

اپنی بیوی کو......

تو آپ شادی شدہ ہیں؟

نعیم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا میرے تین بچے بھی ہیں؟

ویری گڈ!

آپ یہاں نئے لگتے ہیں......کہاں سے ہیں؟

میں میرٹھ سے ہوں۔

میری کلاس کا وقت ہوگیا ہے۔ اکسی کیوز می پلیز! نعیم نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اوہ پلیز! راستہ دیتے ہوئے مس ماریہ نے کرسی پیچھے کی۔

نعیم جب بھی اسکول سے فارغ ہوتے تو بیوی اور بچوں کی تصویر کے سامنے بیٹھ کر ان سے باتیں کرتے۔ کبھی ان کو دیکھکر مسکراتے تو کبھی ان سے دور ہونے پر مایوس ہو جاتے اور سوچتے، جلدی سے کوئی اچھا گھر مل جاتا تو فیملی کو اپنے پاس بلا لیتے۔

دن گذرتے گئے۔ اسکول میں اکثر مس ماریہ سے ملاقات ہوتی۔ ماریہ اتنی اٹریکٹیو تھی کہ نعیم ماریہکو کب دل دے بیٹھے انہیں پتا ہی نہیں

چلا...... رخسانہ اور بچوں سے کیا ہوا وعدہ بھی وہ کب بھول گئے انھیں اس بات کا خیال تک نہ رہا۔

ماریہ اب تم سے جدائی برداشت نہیں ہوتی، کوئی ایسی ترکیب کرو کہ ہم ہمیشہ ساتھ رہیں۔ ماریہ نے نعیم کو کنکھیوں سے دیکھا اور کوئی جواب نہیں دیا۔

رخسانہ نعیم کو برابر خط لکھتی رہی لیکن نعیم نے ان کا ایک بھی جواب نہیں دیا...... پتا نہیں کیا بات ہے؟ رخسانہ فکرمندی سے بولی۔ اور اللہ سے نعیم کی خیریت کی دعا کرتی رہی۔

تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ پوسٹ مین!

رخسانہ اور بچے دروازے کی طرف لپکے۔ ڈاکیے نے رجسٹری رخسانہ کے ہاتھوں میں سونپتے ہوئے کہا، آپ یہاں دستخط کر دیجئے۔

یہ لیجئے آپ کا لیٹر! رخسانہ نے انتہائی خوشی سے لیٹر لیا تو راجو نے کہا کیا ابا کا لیٹر ہے؟ ہاں! بیٹا تمہارے ابا کا ہی لیٹر ہے۔

امی جلدی کھولو نا لیٹر۔ مجھے بھی بتاؤ ابا کب آرہے ہیں ہمیں لینے۔

اچھا بھئی کھولتی ہوں ذرا سانس تو لینے دو۔ دھڑکتے ہوئے دل سے رخسانہ نے لفافہ کھولا اور خط کو لفافے سے باہر نکالا اور جلدی جلدی پڑھنے لگی، لکھا تھا۔ رخسانہ! تم میرا انتظار مت کرنا، میں تمہیں طلاق دیتا ہوں

اور بس۔

رخسانہ کو یقین نہیں ہو رہا تھا کہ آیا وہ خواب دیکھ رہی ہے یا یہ حقیقت ہے۔

اس کے من میں خیال آ رہا تھا کہ میں نے کوئی برا خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔

رخسانہ بت بنی کھڑی رہی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے خط کو دیر تک گھورتی رہی۔ اس کو یقین نہیں ہو رہا تھا کہ جو اس نے پڑھا وہ حقیقت ہے یا فسانہ! یا کوئی برا خواب۔

نہیں، نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ رخسانہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ راجو ماں کی آنکھ سے آنسو دیکھ کر گھبرا گیا اور امی کے دوپٹے کو کھینچ کھینچ پوچھنے لگا امی کیا ہوا؟ امی بولو نا کیا ہوا؟ ابا ٹھیک تو ہیں وہ ہمیں لینے کب آ رہے ہیں؟

رخسانہ نے راجو کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا، اب تیرے ابا کبھی نہیں آئیں گے۔

کیوں امی؟ امی بولو نا! ابا کیوں نہیں آئیں گے؟ بچے کے اس سوال کو رخسانہ برداشت نہیں کر پائی اور دوڑتے ہوئے بیڈ روم میں جا کر بیڈ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور خود سے سوال کرنے لگی آخر میری

غلطی کیا ہے؟ نعیم تو میرے بغیر ایک لمحہ نہیں رہتے تھے۔ میں تو ان کی زندگی تھی ان کی خوشی تھی۔ آج انھوں نے میری محبت کا کیسا بدلہ دیا۔ یہ سوچ کر زور زور سے رونے لگتی۔ راجو امی کی ایسی حالت دیکھ کر پڑوس کی رحیمن بوا کو بلا لایا۔

اری رخسانہ کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے؟ نعیم ٹھیک تو ہے نا؟

رحیمن بوا نے گھبراتے ہوئے ایک ساتھ کئی سوال پوچھ ڈالے۔

رخسانہ نے بھری ہوئی آواز میں کہا بوا! انھوں نے مجھے طلاق دے دی۔

کیا! یہ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ مجھے بتا؟ کیا تو نے جھگڑا تو نہیں کیا تھا؟ وہ تو تجھے بہت چاوے تھا۔

پتا نہیں بوا، ان کا خط بہت دنوں کے بعد آیا اس میں صرف اتنا لکھا تھا کہ میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔

ہاں! بیٹی! مرد جات تو یوں ہی ہووے ہے۔ چل اب تو صبر کر۔ تھاری قسمت میں یوں ہی لکھا تھا سو ہو گیا۔ اب بچوں کی کھاتر تھارے کو جینا بھی ہے اور جمہ واری بھی نبھانی ہے اب تو ہی، ان بچوں کی ماں بھی ہے اور باپ بھی۔

لیکن بوا! انھوں نے ایسا کیوں کیا؟

دیکھ چھوری! مرد کو یہ حق ہووے کہ وہ جب چاہے بگیر کسی کارن

طلاق دے سکے اسلئے اب جو ہوا وہ واپس نہ آسکے، تو اب صبر کرا اور بچوں کو سنبھال۔

ادھر نعیم نے مس ماریہ سے کہا: ماریہ میں نے تمہارے لئے بیوی بچوں سب کو چھوڑ دیا۔ اب بس میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں میں تمہارے بغیر اب اور نہیں جی سکتا۔

مس ماریہ نعیم کی باتیں سنکر مسکرانے لگی۔ اور کہا، نعیم تم تو اپنے بیوی اور بچوں کو بھی اپنی جان سے زیادہ پیار کرتے تھے نا۔

ہاں! ماریہ لیکن میں اب تمہیں اپنی جان سے زیادہ پیار کرتا ہوں!

نعیم تم پیار کے معنی بھی جانتے ہو؟

ماریہ میں بس ایک بات جانتا ہوں کہ میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں اور تمہیں پانا چاہتا ہوں، تمہارے لئے میں نے اپنے پریوار کو چھوڑ دیا۔

اچھا! کیا تم نے میرے لئے اپنے پریوار کو چھوڑا ہے؟ ماریہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

نہیں مسٹر نعیم! تم نے اپنے خاطر اپنے پریوار کو چھوڑا ہے، تم جیسا خود غرض انسان کبھی کسی سے محبت نہیں کرسکتا۔ آج تم نے اپنی چہیتی فرماں بردار بیوی اور بچوں کو میرے خاطر چھوڑ دیا، کل تم مجھے کسی اور کی

خاطر چھوڑ دوگے؟ ہے نا!

مانا کہ طلاق مردوں کا حق ہے۔ وہ جب چاہے بغیر کسی گناہ کے اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے لیکن پھر بھی میں تم پر بھروسہ نہیں کرسکتی۔ تم دھوکے باز ہو! تم جیسا آدمی کبھی کسی سے محبت نہیں کرسکتا اور میں تم جیسے آدمی سے شادی نہیں کرسکتی۔

مسٹر نعیم تم نے اس نیک بیوی کو چھوڑ دیا جس نے تمہارا ہر حال میں ساتھ دیا۔ اور تمہاری خوشی کو اپنی خوشی سمجھی، تمہارے دکھ کو اپنا دکھ سمجھا۔ کبھی تم سے کوئی فرمائش، کوئی شکوہ نہیں۔ آخر تم نے اسکے ساتھ کیا کیا؟

نہیں! نہیں! مسٹر نعیم میں تم سے نفرت کرتی ہوں اور آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔

ماریہ سنو تو! ماریہ! ماریہ

اور ماریہ وہاں سے ہمیشہ کے چلی گئی۔

نعیم اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ اب رخسانہ کے پاس کس منہ سے جاؤں؟ میں اسے اور بچوں کو کیا منہ دیکھاؤں گا؟

گھر اور بچوں کی ذمہ داری رخسانہ کے کاندھوں پر تھی۔ فیس نہ بھرنے پر پرنسپل صاحب نے راجو کو واپس گھر بھیج دیا یہ کہ کر کہ جب تک اسکول کی فیس نہیں بھروگے اسکول آنے کی ضرورت نہیں۔

بچے کو اسکول سے نکالنے پر رخسانہ فوراً پرنسپل صاحب سے ملنے کے لئے اسکول گئی۔ اور پرنسپل صاحب سے التجا کرنے لگی کہ راجو کو اسکول آنے دیا جائے۔

آپ کو معلوم ہے پچھلے تین مہینے سے راجو کی فیس نہیں ادا نہیں ہوئی۔

جی میں جانتی ہوں۔ لیکن کچھ پریشانیوں کی وجہ سے میں فیس نہیں بھر سکی۔ لیکن میں وعدہ کرتی ہوں اگلے مہینے ضرور فیس بھر دوں گی۔

کوئی پرابلم ہے تو بتائیے؟ راجو ہونہار اسٹوڈنٹ ہے۔ آپ کو ایسے بچے کی پڑھائی کا خیال رکھنا چاہیئے۔ کیا راجو کے فادر فیس افورڈ نہیں کر سکتے؟

رخسانہ نے ساری تفصیلات پرنسپل صاحب کے سامنے رکھ دی۔

اچھا! تو یہ بات ہے۔ پرنسپل صاحب نے کچھ دیر سوچا اور کہا دیکھئے ہمارے اسکول میں ٹیچر کی ضرورت ہے اگر آپ چاہیں تو یہ جاب میں آپ کو دے سکتا ہوں۔

رخسانہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے فوراً کہا۔ سر! آپ نہیں جانتے مجھے جاب کی کتنی ضرورت تھی۔ اس مشکل گھڑی میں ساتھ دینے کے لئے میں کس قدر شکر گزار ہوں۔ سر میں آپ کا یہ احسان زندگی

بھر نہیں بھولوں گی۔ بولتے ہوئے رخسانہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

ٹھیک ہے۔کوئی بات نہیں۔آپ کل سے جوائن کرلیں۔

تھینک یوسر!

رخسانہ محنت سے کام کرنے لگی۔ پرنسپل صاحب بھی رخسانہ کے پرفارمینس سے کافی خوش تھے۔رخسانہ کو اسکول میں ٹیچنگ کرتے ہوئے چار سال بیت گئے دھیرے دھیرے رخسانہ نے اپنے دونوں بچوں کو بھی اسکول میں داخل کروادیا۔ پرنسپل صاحب رخسانہ کی محنت، مشقت، رحم دلی ،برتاؤ اور اخلاق سے کافی متاثر تھے۔اور پرنسپل صاحب کی دریا دلی اور اخلاق کی وجہ سے پرنسپل صاحب کی بہت عزت کرتی تھی۔آخر پرنسپل صاحب کافی سلجھے ہوئے انسان تھے۔

ایک دن پرنسپل صاحب نے رخسانہ کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہا میڈم رخسانہ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں اگر آپ برا نہ مانیں تو۔

جی سر! ضرور کہیے

میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ پرنسپل صاحب نے کہا:

اس سے پہلے کی رخسانہ کچھ کہہ پاتی، پرنسپل صاحب نے کہا میں جانتا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔دراصل میری بیوی کے انتقال کو چھ سال گذر گئے لیکن میں نے ابھی تک اس ڈر سے شادی نہیں کی کہ کہیں سوتیلی

ماں میرے بچوں پر ظلم نہ کرے۔لیکن جب سے تمہیں دیکھا ہے میرا خیال ہے کہ تم میرے بچوں کی ماں بن سکتی ہو۔ دیکھو رخسانہ! اس سے میرے بچوں کو تمہاری شکل میں اچھی ماں مل جائے گی اور تمہارے بچوں کو باپ ۔اور ہم دونوں بھی ایک دوسرے کا سہارا بن سکیں گے۔ رخسانہ تمہارا خیال کیا ہے؟

رخسانہ آنکھوں میں خوشی کے آنسو لئے صرف ہاں میں سر ہلا پائی۔

نعیم رخسانہ اور بچوں کو نہ پا کر رحیمن بوا کے گھر پہنچ گیا اور رخسانہ اور بچوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ تجھے اب یاد آئی بیوی اور بچوں کی؟ تو نے تو بیچاری رخسانہ اور بچوں کو اکیلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں تجھ سے پوچھوں تو نے ایسا کیوں کیا؟ رحیمن بوا نے غصہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ بوا میں بہت شرمندہ ہوں ۔میں رخسانہ اور بچوں سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ بوا! بوا! بتاؤ رخسانہ اور بچے کہاں ہیں؟

تیرے جانے کے بعد رخسانہ اور بچوں کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ بھلا ہو پرنسپل صاحب کا جو اس نے بچوں اور رخسانہ کو سہارا دیا۔ رحیمن بوا نے کہا۔

آپ کا کیا مطلب ہے بوا؟

پرنسپل صاحب نے رخسانہ سے شادی بھی کی اور بچوں کو بھی اپنالیا۔
تو نے بہت دیر کر دی بیٹا آنے میں۔ یہ سنتے ہی نعیم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اس کی کشتی پچھتاوئے کے بھنور میں ہچکولے کھانے لگی۔



چال

امنگوں اور آرزوؤں کی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ بہار کا موسم جیسے آ ہی گیا ہو۔ ہزاروں ارمانوں اور خواہشات کے ساتھ سلیم بھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا۔

بیٹا اللہ نے ہمارے سارے دکھ درد دور کر کے ہمیں نعمتوں سے نوازا ہے۔ اور اب تو تمہاری نوکری بھی لگ گئی ہے۔ ماں نے دپٹے کے کونے سے اپنے آنسوؤں کو پوچھتے ہوئے کہا۔

اف امی آپ رو رہی ہیں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔

نہیں پگلے یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ اللہ نے مجھے اتنا خدمت گذار بیٹے سے نوازا ہے۔بس بیٹا میری ایک آخری خواہش ہے؟

وہ کیا امی؟

میں اپنے پوتے کو کھلانا چاہتی ہوں۔ بیٹا تم اب شادی کرلو۔ مجھے بہو لادو۔

دیکھو بیٹا! اگر تمہاری نظر میں کوئی لڑکی ہو تو بتاؤ؟ ورنا گڈن کی اماں تمہارے لئے رشتہ لیکر آئی تھی۔

یہ لڑکی کی تصویر بھی دیکر گئی ہے۔تم دیکھ لو۔

امی نے تصویر کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

امی! میری کوئی پسند نہیں ہے۔آپ کو جو پسند ہے وہ مجھے بھی پسند ہے۔

ٹھیک ہے بیٹا! تو پھر میں رشتہ کے لئے ہاں کر دوں؟

جیسا آپ ٹھیک سمجھیں۔

گھر میں شادی کی شہنائیاں گونجنے لگیں۔ ہر طرف خوشیوں کا سماں تھا۔امی بہو کو دیکھ کر بہت خوش تھیں۔اور اللہ کا شکر ادا کرتے ان کی زبان نہیں تھک رہی تھی۔ کبھی بہو کی بلائیں لیتیں، کبھی اسکی نظر اتارتیں تو کبھی اسے دعاؤں سے نوازتیں۔ دودھو نہاؤ پوتو پھلو کی دعائیں کرتیں۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ سبھی مہمان بھی واپس گھر جا چکے تھے۔ بیٹا! اب تم بھی اپنے کمرے میں جاؤ بہو انتظار کر رہی ہوگی۔

کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر کے کرن کے نزدیک بیڈ پر بیٹھ گیا۔

ماشاء اللہ! کرن تم بہت خوبصورت ہو۔ لیکن سنو! میں تم سے ایک بات ابھی صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں۔ دنیا میں میری امی میرے لئے سب کچھ ہے۔ ابو کے انتقال کے بعد امی نے بہت محنت مشققت سے مجھے پال پوس کر بڑا کیا۔ مجھے پڑھایا لکھایا۔ میں اپنی امی سے بہت محبت کرتا ہوں۔ کرن اسلئے میں چاہتا ہوں کہ امی کو کبھی بھی کوئی تکلیف نہ ہو۔ لیکن سنو! تم بھی میرے لئے بہت معنی رکھتی ہو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ ارے بیٹا صبح ہوگئی۔ تم دونوں کے لئے چائے لائی ہوں۔

کرن نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ السلام علیکم امی!

وعلیکم السلام جیتی رہو بیٹی۔ امی نے بڑی شفقت سے کرن کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

تم دونوں تیار ہو جاؤ میں تمہارے لئے ناشتہ تیار کرتی ہوں۔

تھوڑی ہی دیر میں امی نے ناشتہ ڈائنگ ٹیبل پر لگا کر بچوں کو آواز لگائی۔

ارے یہ کیا بیٹا! تم آج آفس جا رہے ہو؟

ہاں امی!

ناشتے کے بعد سلیم نے امی سے اجازت لی اور آفس کے لئے روانہ ہوگیا۔

کرن یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

شام کو سلیم آفس سے لوٹتا تو پہلے امی کے کمرے میں داخل ہوتا۔ امی کی خیریت معلوم کرتا۔ اور اس کے بعد اوپر کرن کے پاس جاتا۔

سنو! آج ہم کہیں گھومنے چلیں گے۔ کرن نے کہا۔

ٹھیک ہے تم تیار ہو جاؤ میں ذرا امی سے اجازت لے کر آتا ہوں۔

اف! آپ ہر وقت امی امی کیوں کرتے رہتے ہیں؟ کیا ہر چھوٹی بات کے لئے امی سے اجازت لینا ضروری ہے؟

میں تو تنگ آ گئی ہوں۔ کرن نے غصے میں کہا۔

کرن! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ امی منع تھوڑی ہی کر دیں گی۔ امی سے اجازت لینے میں کیا برائی ہے؟

مجھے ایسی باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ

دیا تھا۔ مجھے اپنی امی کے خلاف کوئی بات پسند نہیں۔

تو ٹھیک ہے۔ اگر تمہارے لئے میری کوئی اہمیت نہیں ہے تو میں اپنے میکے واپس جارہی ہوں۔

کرن! میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں اپنی امی سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں تم سے بھی بہت محبت کرتا ہوں۔ بس میں امی کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر پھر بھی تم میکے جانا چاہتی ہو تو پھر تمہاری مرضی۔

ٹھیک ہے میں اس گھر میں ایک منٹ نہیں رہ سکتی جہاں میری کوئی قدر نہ ہو۔ کرن نے بیگ اٹھایا اور کمرے کا دروازہ زور سے پٹکتے ہوئے باہر نکل گئی۔ امی نے کرن کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر کرن نے ایک نہ سنی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر کی طرف لوٹ گئی۔

ارے کرن تم اچانک کیسے آگئیں۔ داماد جی کہاں ہیں؟ سب خیریت تو ہے نا؟ کرن کی ممی نے پوچھا

میں وہ گھر ہمیشہ کے لئے چھوڑ آئی ہوں۔

لیکن کیوں؟ کیا ہوا؟ مجھے بتا؟

کرن نے ماں کو سارا قصہ کہہ سنایا۔

کرن کی ماں نے سارا قصہ سننے کے بعد کچھ دیر سوچا اور اپنی شیطانی دماغ سے سوچا اور بیٹی کو سب سمجھا دیا۔

سمجھ گئی بیٹی! ٹھیک ہے امی! یو آر جینیس!

میں نے سلیم کو فون کر دیا ہے اور وہ تجھے لینے آ رہا ہے لیکن خیال رہے چال ایسی چلنا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ سمجھ گئی بیٹی!

جی ممی!

اور یاد رہے اگر ذرا بھی چوک ہوئی تو بڑھیا کے لئے سلیم کے دل میں محبت اور بڑھ جائے گی۔ اور سلیم تجھ سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گا۔ کیا تو ایسا چاھتی ہے؟

نہیں ممی! آپ جیسا کہیں گی میں ویسا ہی کروں گی۔

دروازے پر کار کا ہارن بجنے لگا۔ کرن کی ماں نے کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہٹاتے ہوئے باہر دیکھا۔ کار میں سلیم بیٹھا کرن کا انتظار کر رہا تھا۔ کرن کی ماں نے کہا ڈرامہ شروع کرو۔

کرن ہاتھ میں بیگ لئے واپس سلیم کے ساتھ ہولی۔ گھر جا کر کرن نے سلیم سے معافی مانگی۔ سلیم نے کرن کے پچھتاوے کے آنسو دیکھ کر اسے گلے لگا لیا۔

مجھے معاف کر دیجئے سلیم پلیز۔

ارے پگلی! سلیم نے کرن کے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔

نہیں سلیم آپ مجھے کہہ لینے دیجئے۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں تمہاری

امی کو اب سے اپنی ماں سمجھوں گی۔ مجھے پلیز معاف کر دیجئے۔ٹھیک ہے سلیم نے کہا

نیچے سے امی کی آواز آئی! سلیم بیٹا

آپ رکیے میں جاتی ہوں۔

کرن نے امی سے بھی معافی مانگی۔ امی آپ مجھے معاف کر دیجئے! مجھ سے غلطی ہوگئی۔

امی نے بہو کو گلے سے لگا لیا۔

کرن امی کی بڑھ چڑھ کر خدمت کرنے لگی۔کبھی ان کا سر دباتی تو کبھی ان کا پیر دباتی۔سارا سارا دن امی کی خدمت میں گزارتی۔

یہ لو تمہاری تنخواہ! اب تمہیں اور کام پر آنے کی ضرورت نہیں۔ کرن نے نوکرانی کا حساب کرتے ہوئے کہا۔اور جا کر کچن میں امی کے لئے سوپ بنانے لگی۔سلیم شام کو آفس سے تھکا ہارا آیا اور اس نے کرن کو چائے بنانے کے لئے کہا۔

کرن! میرے لئے ذرا چائے بنادو میرے سر میں کچھ درد ہو رہا ہے۔

سنو سلیم! کبڈ میں وکس رکھی ہے۔ اسے لگا لو اور خود چائے بنالو۔ مجھے امی کے سر میں تیل لگانا ہے۔شام سے امی کے سر میں کچھ درد تھا۔اور یہ کہ کر کرن امی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

رات زیادہ ہوگئی تھی ۔ سلیم کرن کا انتظار کرتا رہا لیکن کرن کمرے میں نہیں آئی ۔ سلیم کمرے سے نکلا اور امی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو کرن امی کے پاس سوئی ہوئی تھی ۔

کرن ! کرن ! سلیم نے دبی ہوئی آواز میں کرن کو اٹھایا اور کہا چلو اپنے بیڈ روم میں چلو

کرن نیند سے فوراً اٹھ بیٹھی اور ہونٹ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا! شو۔۔۔ امی ابھی سوئیں ہیں ۔ آپ جا کر سو جائیے میں امی کو چھوڑ کر نہیں آ سکتی ۔ معلوم ہے آپ کو دن بھر امی کو کتنا بخار تھا ۔ ابھی بس تھوڑی آنکھ لگی ہے ۔ آپ چلیں آرام کریں میں یہیں امی کے پاس ہوں ۔ کیا معلوم امی کو کب کس چیز کی ضرورت پڑ جائے ۔

سلیم اپنے بیڈ روم میں چلا گیا ۔ کروٹ بدلتے بدلتے نہ جانے کب اسکی آنکھ لگ گئی ۔ صبح زور زور سے الارم بجنے لگا ۔ سلیم ہڑبڑا کر جلدی جلدی اٹھا اور ٹائم دیکھا تو آفس کے لئے دیر ہو رہی تھی ۔ جلدی سے واش روم سے باہر آیا اور الماری میں شرٹ تلاش کرنے لگا ۔

کرن ! کرن ! جلدی آؤ

کیا ہے؟

تم دن بھر کرتی کیا ہو؟ مجھے آج تم نے آفس کے لئے اٹھایا بھی

نہیں اور اب ایک بھی شرٹ نہ تو دھلی ہے اور نہ پریس۔اب میں کیا پہن کر آفس جاؤں گا؟ بولو

میں دن بھر کوئی خالی نہیں بیٹھی رہتی۔دن بھر امی کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔مجھے فرصت نہیں تمہارے کاموں کی۔اور آج کل سردی کی وجہ سے امی کو کھانسی اور بخار رہتا ہے۔امی کو ہسپتال ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔اور۔۔۔۔۔

بس کرو۔میں نے دن بھر کے کاموں کا حساب تم سے نہیں مانگا ہے۔میں آفس کیا پہن کر جاؤں۔سلیم نے کہا۔

دیکھو جی آپ خود پریس کر لیجیے۔امی کی دوا کا ٹائم ہو گیا ہے میں جاتی ہوں۔

اف! سلیم نے پریس کو زمین پر غصہ میں پٹخ دیا۔اور امی سے ملے بغیر بیگ لیکر بغیر ناشتے کے آفس کے لئے نکل گیا۔

شام کو آفس سلیم لوٹا تو دیکھا کرن امی کے پاس بیٹھی کوئی کتاب پڑھ کر سنا رہی تھی۔یہاں تک کہ اسے سلیم کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔

سلیم نے کافی دیر کے بعد کرن کو پھر آواز دی۔

آپ آفس سے کب آئے؟ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا

ابھی آیا۔تم امی کے پاس بیٹھی تھیں

ہاں! وہ میں امی کو کتاب پڑھ کر سنا رہی تھی۔امی کا دل بہل جاتا ہے اور معلوم ہے آج کیا ہوا امی نے۔۔۔۔

بس کرو کرن! ہر وقت امی امی کرتی رہتی ہو کبھی تم نے سوچا ہے؟ میں کتنا اکیلا رہ گیا ہوں۔بس اب اور نہیں

یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔امی کے لئے کیسی باتیں کر رہے ہیں۔

میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔تم مجھے بالکل بھول چکی ہو۔ہر وقت امی کے پاس رہتی ہو۔

کیوں نہ رہوں۔آخر تمہاری امی میری ماں جیسی ہیں۔اور ماں کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔ معلوم ہے نا؟

ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہوتی ہے تو تم میری زندگی کیوں جہنم بنا رہی ہو۔سلیم نے بہت غصے میں کہا۔

بس اب اور نہیں۔میں نے امی کا انتظام کر دیا ہے۔

کیا انتظام؟ کرن گھبراتے ہوئے پوچھا۔

اچانک دروازے پر ایک وین آ کر رکی۔

یہ گاڑی آپ نے کیوں بلائی ہے۔

یہ گاڑی اولڈ ایج ہوم سے آئی ہے۔سلیم نے جواب دیا۔

لیکن یہ کس لئے؟

اب امی ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔انھیں میں اولڈ ایج ہوم بھیج رہا ہوں۔

مگر کیوں؟ وہاں ان کی دیکھ بھال کون کریگا؟

اسکی تم فکرمت کرو۔ وہاں اورلوگ بھی رہتے ہیں۔اوران کی دیکھ بھال کے لئے ملازم ہوتے ہیں۔امی وہاں زیادہ خوش رہیں گی۔اورہم بھی۔

مگر۔۔۔۔کرن نے کچھ بولنا چاہا۔توسلیم نے انگلی دیکھا کر اسے چپ کرادیا۔

سلیم کے سامنے ڈرامہ کرتے ہوئے کرن روتے ہوئے گھر کے اندر چلی گئی۔

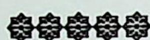
کچھ دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔

ٹرن ٹرن! ہیلو! دوسری طرف سے آواز آئی۔

مبارک ہومی! آپ کی چال کامیاب رہی۔ بڑھیا ہمارے پلان کے مطابق اولڈ ایج ہوم جا چکی ہے۔ بڑھیا کی خدمت کرتے کرتے تو میرے ہاتھ پیر تھک گئے تھے۔لیکن ممی آپ کا پلان واقعی solid تھا۔اب استنے بڑے گھر کی میں اکیلی رانی ہوں۔اب صرف میرا ہی حکم چلے گا۔ورنا وہ بڑھیا تو میری آنکھ میں کانٹے طرح چبھتی تھی۔

ممی! آپ نے اس بڑھیا کو دودھ میں مکھی کی طرح نکال دیا۔ میں سلیم کی نظروں میں خدمت گذار بہو ثابت ہوئی۔ اور وہ بے وقوف ہماری چال کو سمجھ بھی نہ سکا۔ آپ نے سہی کہا تھا ممی! سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی۔

اور زور زور سے کرن اور اسکی ماں ہنسنے لگیں۔



BIKHRE RANG

(Collection of Short Stories)

by : Dr. Aqeela



”بکھرے رنگ“ کی سبھی کہانیوں میں کسی نہ کسی سماجی پہلو کو واقعاتی رنگ میں پیش کرنے کی دلچسپ کوشش کی گئی ہے اور افسانہ نگار نے بڑی ہوشمندی سے ہر کہانی کو انجام تک پہنچانے کا فنکارانہ مظاہرہ کیا ہے جو کہ افسانہ تخلیق کرنے کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ اگر ان اہم چیزوں پر نظر نہیں ہوگی تو افسانے کی مشق بے کار بن جاتی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر عقیلہ صاجبہ کو اس خوبصورت افسانوی گلدستہ کے لئے مبارک باد!

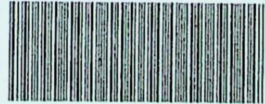
ڈاکٹر ریاض توحیدی

زیر نظر افسانوی مجموعہ ”بکھرے رنگ“ میں شامل تمام افسانوں کا موضوعاتی اور فنی اعتبار سے مطالعہ کرنے کے بعد مجھے ذاتی طور پر اس بات کی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر عقیلہ افسانہ مزاج ہیں اور افسانہ نگاری کے ذریعے انھوں نے خواتین کے مسائل کو ابھارا ہے۔ ان کے افسانوی کردار ہمارے ماحول و معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں دلچسپ مکالمہ نگاری کا عنصر موجود ہے۔ انھوں نے علامتیت، تجریدیت اور استعاریت کے بجائے بیانیہ اسلوب میں افسانے لکھے ہیں جو قاری کے ذہن و دل میں بہ آسانی اپنا گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے ان کا افسانوی مستقبل انشاء اللہ تابناک ہوگا اور ان کے پہلے افسانوی مجموعے ”بکھرے رنگ“ میں جو نسائی جذباتیت در آئی ہے وہ ادبی حلقوں میں ایک ہلچل سی پیدا کر دے گی۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA

ISBN 978-93-89733-92-1



www.ephbooks.com